مجلس ادارت

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰/روپے ۔ فی شمارہ ۱۲/روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ۔ ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:

حافظ سجاد الٰہی ۷۶ اے، مال گودام روڈ، لوہا مارکیٹ، بادامی باغ، لاہور، پنجاب (پاکستان)

Mobile: 3004682752 ----- Phone: (009242) 7280916 5863609

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۹ ماہ محرم الحرام ۱۴۲۸ھ مطابق ماہ فروری ۲۰۰۷ء عدد ۲

فہرست مضامین

ای میل: email: shibli_academy@rediffmail.com

شذرات

۱۹۴۷ء سے پہلے ہندوستان اور پاکستان ایک ہی ملک تھے گو اب یہ دو ملک بن گئے ہیں اور ان کے درمیان سرحدیں حائل ہوگئی ہیں لیکن اس کی وجہ سے صدیوں سے قائم نہ علمی، تہذیبی اور ثقافتی تعلقات ختم ہوسکتے ہیں اور نہ اعزہ واقربا کے دونوں ملکوں میں بٹ جانے سے خونی رشتے منقطع ہوسکتے ہیں، دونوں ملکوں کا فائدہ اسی میں ہے کہ یہ مل جل کر رہیں، ان کے تعلقات خوش گوار ہوں اور وہ اپنے متنازع امور کو کسی اور ملک کی مداخلت کے بغیر خود ہی بات چیت کرکے طے کرلیں اور آپس کے گلے شکوے، رنجش اور عداوت دور کرلیں تاکہ ہر قسم کی کشمکش، آویزش اور ٹکراؤ کا سدباب ہوجائے بلکہ دو دوستوں یا دو بھائیوں کی طرح امن چین سے رہیں، ایک ملک سے دوسرے ملک میں آنے جانے کی سہولت اور تجارت اور لین دین کی آسانی ہو تو دونوں جگہ ترقی اور خوش حالی کی لہر دوڑنے لگے گی اور دونوں کا دفاعی بجٹ بھی کم ہوجائے گا، اس سے سب سے زیادہ خوشی دونوں ملکوں کے عوام کو ہوگی کیوں کہ وہ امن کو پسند اور جنگ سے نفرت کرتے ہیں اور یہی بات دونوں ملکوں کے حکم رانوں کو بھی سمجھ لینی چاہیے کہ امن، مفاہمت اور بقائے باہم کا راستہ اختیار کرنے ہی میں ان کی فلاح اور بھلائی ہے اور جنگ میں ان کی بربادی اور تباہی ہے، اس فضا کو بنانے میں این ڈی اے حکومت نے بھی پہل کی تھی اور اب یو پی اے حکومت بھی اسے آگے بڑھانے کی کوشش کررہی ہے، دوسری طرف پاکستانی حکم راں بھی لچک دکھلا رہے ہیں۔

دونوں ملکوں میں مشترکہ تہذیب وثقافت کے ورثے اور گوناگوں یادگاریں ہیں جن میں ایک ٹکشلا کا قدیم تاریخی شہر بھی ہے جو علم وحکمت اور تہذیب وثقافت کا گہوارہ رہ چکا ہے، پانچویں صدی قبل مسیح سے دوسری صدی عیسوی تک یہ بدھ تعلیمات کا عظیم مرکز اور چانکیہ جیسے ذی علم، مدبر اور سیاست داں کی جنم بھومی تھا، جس کو یونیسکو نے بھی عالمی ورثہ قرار دیا ہے، نالندہ کی طرح یہاں کی یونی ورسٹی کی بھی بڑی شہرت تھی جس کے کھنڈروں میں مہاتما بودھ کے ہزار سالہ قدیم مجسمے موجود ہیں، ہندوستان کے وزیر خارجہ پرنب مکھرجی حال ہی میں پاکستان گئے تو علم وثقافت کا یہ مرکز بھی دیکھنے گئے جو اسلام آباد سے ۳۵ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، انہوں نے ٹکشلا یونی ورسٹی اور اس کے کھنڈر اور میوزیم کو دیکھا اور وزیٹرس بک میں نوادر کو بہتر انداز سے رکھے جانے کی تعریف کی اور یہ بیان دیا کہ ہمارا مشترکہ ورثہ اور تہذیب ہمیں مفاہمت اور دوستی کے تحت موجودہ بحران کو حل کرنے سے قریب لاتا

ہے، ہمارے ماضی سے حال تک ایک تسلسل ہے جو مستقبل میں ہماری رہنمائی کرے گا، ہندوستان اور پاکستان کو دیرینہ مسائل کے تصفیہ کے لئے اپنے درمیان کے تہذیبی روابط سے مدد لینی چاہیے، اس سے ایک روز پہلے دونوں ملکوں نے اس پر اتفاق کیا تھا کہ پاکستان میں ٹکشلا اور حسن ابدال اور ہندوستان میں نوئیڈا اور گوڑگاؤں کے دورہ کی سفارت کاروں کو آسانی دی جائے گی، یہاں یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ پرنب مکھرجی نے جس تسلسل کو نظر انداز نہ کرنے کی تلقین کی ہے اسے فراموش کرکے چودہ برس پہلے ان کے ملک میں ایک تاریخی وتہذیبی ورثے کو بڑے فخر سے گرادیا گیا اور اب بھی نہ جانے کتنے ورثے فسطائیت پسندوں کے نشانے پر ہیں۔

آزادی کے بعد ہی سے اردو کے ساتھ جو معاندانہ اور سوتیلا برتاؤ ہو رہا تھا وہ اب مذاق میں تبدیل ہوگیا ہے، یہ مذاق تو عرصے سے چلا آرہا ہے کہ جن ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دیا گیا ہے ان میں بھی کہیں سرکاری محکموں میں اردو کا رواج نہیں ہے، اگر درخواستیں اردو میں دی جاتی ہیں تو وہ قبول نہیں کی جاتیں، نوکر شاہی کے بول بالا کے آگے کسی کی نہیں چلتی، خاص طور سے اردو کے معاملے میں نہ وہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے احکام کو مانتی ہے اور نہ عدالتوں کے فیصلوں کی پروا کرتی ہے، ریاستی حکومتوں کی طرف سے یہ اعلان بھی کیا جاتا رہا ہے کہ اردو کا استعمال کہاں اور کن موقعوں پر ہوگا، اس کے باوجود اردو کو حکومت کے دفاتر میں بار پانے کا موقع نہیں ملا، اس سے بڑھ کر افسوس ناک امر یہ ہے کہ اردو کی انجمنیں، تنظیمیں، ادارے اور وہ افراد جو اس کے فدائی، مجاہد اور محافظ کہے جاتے تھے اردو کے ساتھ ہونے والے مذاق سے مضطرب اور پریشان نہیں ہیں، پہلے وہ بہت جلد حرکت میں آجاتے تھے مگر اب ان کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی، سوائے اتر پردیش اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے۔

اردو کے ساتھ نوکر شاہی کے مذاق نے بڑی مضحکہ خیز اور بھونڈی شکل اختیار کرلی ہے اور اردو کی خالی جگہوں پر وہ لوگ فائز کئے جارہے ہیں جو اس کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہوتے، عرصے سے اس طرح کی بدعنوانیوں کی آواز ہمارے کانوں میں پڑ رہی تھی مگر یقین نہیں ہوتا تھا لیکن اخباروں سے معلوم ہوا کہ بی ٹی سی ٹریننگ برائے اردو ۲۰۰۶ء کے لئے کان پور کے بیسک تعلیم وتربیت سنٹرول کانپور نگر نگم نے ۱۶ر دسمبر کو اخبارات میں بی ٹی سی اردو ٹریننگ کے لئے منتخب کئے گئے ۴۹ امیدواروں کی جو فہرست جاری کی ہے ان میں ۲۵ غیر مسلم ہیں، گویا ۵۰ فیصد غیر مسلم اب اردو داں ہوگئے ہیں، ظاہر ہے یہ دھوکا اور فریب ہے اور نوکر شاہی ٹریننگ کے دوران ان لوگوں کو معاوضہ دے رہی ہے جن

کا کوئی واسطہ اردو سے نہیں ہے، پھر دو سال کی ٹریننگ مکمل ہونے کے بعد ہی ان کا تقرر اردو ٹیچرس کی حیثیت سے ہوسکتا ہے لیکن حکومت نے اس سال اردو ٹیچرس کی اسامیوں کی بھرتی کے لئے جو اشتہارات نکالے تھے ان میں اردو ٹیچر کا نام نہیں آنے دیا ہے بلکہ اسسٹنٹ ٹیچر کے طور پر تقرر کا اعلان کیا ہے جب کہ پہلے خود اساتذہ کی تقرری میں اس کی صراحت ہوتی تھی کہ یہ اسامیاں اردو اساتذہ سے ہی پُر کی جائیں گی، بہار میں بھی یہی کھیل ہو رہا ہے، سمستی پور ضلع کے سرائے رنجن بلاک حلقے کے تمام اردو مکاتب کو ایک منظم سازش کے تحت ہندی اسکولوں میں تبدیل کرنے کی مہم بلاک ایجوکیشن افسر نے شروع کی ہے، سرکاری اور پرائمری اسکولوں سے اردو اساتذہ کے عہدوں کو ختم کر کے ان میں غیر اردوداں اساتذہ کا تقرر کر رہے ہیں، اس سے قبل بھی اسی افسر نے اردو مکتبوں میں ایک کے بدلے دو دو ہندی ماسٹروں کا تقرر کر دیا تھا اور اس بار بھی وہ اردو کی شناخت ختم کر کے غیر اردوداں ماسٹروں کا تقرر کر رہے ہیں، یہ سطریں لکھی جاچکی تھیں کہ خبر ملی کہ ایس سی آر ٹی اتر پردیش لکھنؤ نے بی ٹی سی اردو ٹریننگ کا نصاب دیوناگری رسم الخط میں تبدیل کر دیا ہے اور بی ٹی سی اردو ٹریننگ ہندی میڈیم میں دلا رہا ہے۔

یورپ اور امریکہ میں دار المصنفین کا آوازۂ شہرت پہلے سے بلند تھا، اب الحمد للہ وہاں اس کے قدرشناسوں کا ایک حلقہ بھی ہوگیا ہے، جناب انضال عثمانی کا وطن اعظم گڈھ کے نواح میں فتح پور تال رتوے ہے لیکن ان کی پیدائش اور نشوونما ممبئی میں ہوئی اور وہیں کے اردو میڈیم اسکول سے ہائی اسکول پاس کیا اور اعلا تعلیم علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں حاصل کی، تہذیب الاخلاق اور ہال میگزینوں میں ان کے مضامین بھی چھپے ہیں، وہ اولوالعزم اور حوصلہ مند ہیں، ۳۳ برس کی عمر ہی میں ترقی کی طرف ان کا قدم گام زن ہے، پچھلے دو برسوں سے وہ (Austin Texas U.S.) میں ہیں اور Motorola Inc میں بہ حیثیت پروجیکٹ منیجر خدمت کر رہے ہیں، اس کے علاوہ AMUNetwork@yahoogroups.com بھی ان کے زیر اہتمام چل رہا ہے جو سب سے بڑا ای میل نیٹ ورک ہے اور دنیا کے تقریباً سات ہزار علی گیرین اس سے وابستہ ہیں، اب دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کی تحریک سے ان کی توجہ دار المصنفین کی طرف ہوئی ہے اور اس کی مجلس انتظامیہ کے نئے ارکان ڈاکٹر اے عبداللہ (واشنگٹن) اور ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں ایڈیٹر ملی گزٹ دہلی کے تعاون سے انہوں نے اس کا درج ذیل ویب سائٹ تیار کیا ہے:

http://Shibliacademy.blogspot.com

☆☆☆☆

مقالات

اسلامی تصوف - تعارفی جائزہ

از:- ڈاکٹر خواجہ محمد سعید☆

میرا یہ مقالہ دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں اسلامی تصوف کی تاریخ اور دوسرے حصے میں تصوف کا تعارفی جائزہ شامل ہے، تمام محققین اس بات میں متفق ہیں کہ تصوف کا مادہ عربی زبان میں "صوف" یعنی اون ہے (۱) لیکن اس بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ اون کا رنگ کیسا تھا؟ بعض محققین کا خیال ہے کہ اون سفید رنگ کی تھی مگر بعض نے اس بحث میں الجھنے سے گریز کی ہے، ایک بات واضح ہے کہ عیسائی پادری سفید اون کا چوغا پہنتے تھے (۲) لیکن اسلام میں صوفی کے لئے کوئی ایسی قید نہیں البتہ صوفی عادتاً اونی لباس پہنتے تھے، اصطلاح میں صوفی کا لفظ ایک ایسے شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے جو اپنی زندگی کو صوفیانہ انداز کے لئے وقف کر دے، اسلام میں یہ لفظ اہل صفہ سے منسوب ہے جو کہ نبی پاک ﷺ کے دور میں مسجد نبوی کے شمال کی جانب ایک چبوترے پر قیام کیا کرتے تھے لیکن اس لفظ یعنی صوفی نے نبی پاک ﷺ، خلافت راشدہ اور بنوامیہ کے دور کے بعد مسلمانوں میں رواج پایا۔ (۳)

بابائے کیمیا جابر بن حیان نے آٹھویں صدی عیسوی کے نصف میں اپنے نام کے ساتھ صوفی کا لفظ استعمال کیا، اس کے بعد صوفیا کی اصطلاح کوفہ سے چلی جس کو ایک جماعت کے معنی میں استعمال کیا گیا، بعد میں یہ لفظ دسویں صدی عیسوی میں عراق اور خراسان کے سنی زاہدوں نے استعمال کیا، یوں تصوف سنی اسلام کا جزلازمی بن گیا۔ (۴)

اس سے قبل کہ اس موضوع پر مزید بحث کی جائے چند مفکرین کی آراکا ذکر کرنا ضروری

☆ شعبۂ فلسفہ، جامعہ پنجاب، لاہور، پاکستان۔

ہے،اے-جے-آربری A.J.Arberry کے خیال میں اسلام میں تصوف کا آغاز بدھ مت کے راہبوں کی وجہ سے ہوا،اس نے ابراہیم بن ادہم کی مثال دی ہے جن کا تعلق بلخ سے تھا اور بلخ میں بدھ مندر تھے (۵)،اس کے برعکس آر-اے-نکلسن R.A. Nicholson کا خیال تھا کہ آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے عیسائی پادریوں سے متاثر ہوکر اسلام میں تصوف کا آغاز کیا ہے (۶)،ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا خیال تھا کہ اسلام میں تصوف کی ابتدا کی پانچ وجہیں ہیں:

۱-مسلم تاریخ میں کش مکش اور فساد کی ابتدا۔

۲-اسلام میں مختلف فقہوں کا غیر جذباتی زہد۔

۳-عباسی خلیفہ المامون کی وجہ سے مختلف الخیال علما میں بحث کا رواج۔

۴-بعض مسلم زاہدوں کا مامون کے دور سے یونانی علوم کے مسلط ہونے سے ناخوش ہونا کیوں کہ یونانی علوم کے احیا سے لوگوں کے اخلاق کمزور ہوگئے اور مذہب اسلام کے بارے میں لوگوں کا جوش وخروش مدہم پڑ گیا۔

۵-عیسائی پادری کا وجود،اگر چہ اسلامی تصوف عیسائی پادری کے طرز سے مختلف ہے لیکن پھر بھی عیسائی پادری کے نمونہ نے اس سلسلے میں کافی مدد بہم پہنچائی۔(۷)

ان میں بعض دلائل کو قبول کرنا مشکل نظر آتا ہے کیوں کہ ابتدائی دور میں اسلام کا واسطہ نہ صرف عیسائیت اور بدھ مت سے تھا بلکہ زردشت مذہب سے بھی تھا،خود نبی پاک ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی ملاقاتیں عیسائی پادریوں اور راہبوں سے ہوئیں،ان میں سے بعض نے نبی پاک ﷺ کے پاس حاضر ہوکر اسلام قبول کیا لیکن اس وقت کسی کو خیال نہ آیا کہ وہ صوفی بن جائے،خلافت راشدہ کے دور میں کئی علاقے فتح ہوئے اور ان علاقوں کو اسلامی سلطنت میں شامل کیا گیا،ان علاقوں میں عیسائیوں کا بڑا زور تھا،اس کے باوجود خلافت راشدہ میں تصوف کی ابتدا اس انداز سے نہیں ہوئی جو کہ بعد کے دور میں ہوئی،لہذا آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں میں تصوف نے جو زور پکڑا اس کی اصل وجہ داخلی تھی نہ کہ کوئی خارجی اثر تھا۔

اگر چہ تاریخ تصوف کے حوالے سے کسی مسلمان کی کوئی مستند کتاب موجود نہیں البتہ مغربی مستشرقین نے اس پر لکھا ہے جس کو حرف آخر نہیں سمجھا جاسکتا،جب ہم تاریخ اسلام کا مطالعہ

کرتے ہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافت بنوعباس میں جب خلافت،بادشاہت میں تبدیل ہوئی تو بنوامیہ نے زیادہ شان وشوکت کا روپ دھارلیا،اس کے مقابلے میں بعض مسلمان زاہدوں نے فقر وفاقہ کی زندگی کو ترجیح دی اور اس طرز زندگی کو صوفیانہ طرز زندگی کا نام دیا،اس کا ذکر حضرت داتا گنج بخش کی کتاب ''کشف المحجوب'' میں بھی ملتا ہے (۸)،اس وقت سے لے کر آج تک تاریخ تصوف کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

محققین کا خیال ہے کہ پہلا دور دوسری صدی ہجری سے لے کر چوتھی صدی ہجری تک محیط ہے،اس دور میں صوفیا کے مراکز میں عراق،شام،ایران وخراسان کے علاقے شامل تھے، مشہور صوفیا حضرت ذوالنون مصریؒ،حضرت جنیدؒ،امام جعفر صادقؒ،حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کا تعلق اسی دور سے تھا،اس کے علاوہ سینکڑوں صوفیا کا تعلق بھی اسی دور سے تھا،ان تمام صوفیا کی بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ سب عربی زبان اور شریعت اسلامیہ کی زبان میں شریعت کو سمجھتے تھے،چنانچہ اس دور میں تصوف کے بارے میں جتنی بھی کتابیں لکھی گئیں وہ سب عربی زبان میں تھیں۔

تصوف کے دوسرے دور کا آغاز پانچویں صدی ہجری سے شروع ہوکر ساتویں صدی ہجری تک ہے،اس دور کے مشہور صوفیا میں حضرت علی ہجویریؒ المعروف داتا گنج بخش صاحب، امام غزالیؒ اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ شامل ہیں،اس دور میں عربی کے ساتھ فارسی زبان میں بھی کتابیں لکھی گئیں،اس دور کا اختتام جلال الدین رومیؒ عرف مولانا روم پر ہوتا ہے،اس دور میں فارسی زبان کی پہلی کتاب ''کشف المحجوب'' ہے جو کہ تصوف پر لکھی گئی،مولانا روم نے اپنی مثنوی میں تصوف کے خیالات کو انتہا تک پہنچادیا،فارسی ادب میں تصوف کا یہ سنہری دور تھا۔

تیسرا دور ساتویں صدی سے لے کر گیارہویں صدی تک محیط ہے،تاریخ برصغیر پاک و ہند میں یہ دور تصوف کا سنہری دور مانا جاتا ہے،اس دور میں مشہور صوفیا حضرت معین الدین چشتیؒ، خواجہ بختیار کاکیؒ،حضرت نظام الدین اولیاؒ،شیخ فریدالدین عطارؒ شامل ہیں،دیگر بہت سے صوفیا بھی اس دور میں پیدا ہوئے،ان تمام صوفیا نے برصغیر میں اسلام کی بڑی خدمت کی اور برصغیر میں اسلام کے فروغ کے لئے ان کی تعلیمات کا بڑا اہم کردار ہے۔

آخری دور میں اگر چہ صوفیا کا سلسلہ جاری رہا لیکن ان کی عظمت اور شان میں کمی واقع

ہوئی، اگرچہ عوام میں ان کی مقبولیت آج بھی عام ہے مگر پہلے ادوار کے صوفیا کے مقابلے میں ان کا کردار بہت فروتر نظر آتا ہے۔

تصوف کے دوسرے دور تک صوفیا بارہ گروہ میں بٹ چکے تھے، بہ قول حضرت داتا گنج بخشؒ ان میں سے دس گروہ شریعت محمدیہ ﷺ کے مطابق تھے، جب کہ دوسرے گروہ شریعت کے خلاف تھے، یہی وجہ ہے کہ حضرت داتا گنج بخشؒ نے اپنی کتاب ''کشف المحجوب'' میں انہیں ''مردود'' اور ''ملحد'' لکھا ہے (۹)، جب اسلام تصوف کے تیسرے دور میں پہنچا تو صوفیا کے چودہ گروہ ہو چکے تھے، یہ تمام گروہ برصغیر پاک وہند میں موجود تھے (۱۰)، اگرچہ ان میں سے صرف چار گروہ نے برصغیر پاک وہند میں مقبولیت پائی اور ان کی شہرت آج بھی قائم ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے بارے میں تفصیلاً بحث کی جائے۔

ان تمام گروہوں کا ذکر ابوالفضل نے آئین اکبری میں کیا جن کا ذکر ''کشف المحجوب'' میں ملتا ہے، جہاں اس نے برصغیر میں موجود چودہ سلسلوں کو بھی بیان کیا ہے، یہ سلاسل اس طرح ہیں حبیبیاں، طیفوریان، کرخیاں، سقطیاں، جنیدیاں، کازونیاں، طوسیاں، فردوسیاں، سہروردیاں، زیدیاں، عباسیاں، ادہمیاں، ہبریاں اور چشتیاں، البتہ قادریہ اور نقشبندیہ کا ذکر آئین اکبری میں نہیں ملتا ہے، یہ شاید اس لئے کہ ان دو سلسلوں نے اکبر کے ''دین الٰہی'' کی مخالفت کی لیکن آگے چل کر ابوالفضل نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں ان سلاسل کے بے شمار سلسلے زبان زد روزگار ہیں، جیسے قادری۔

اس کے بعد انہوں نے نقشبندی سلسلے کا بھی ذکر کیا ہے، یوں مطالعہ آئین اکبری سے چودہ سلسلوں کا پتہ چلتا ہے جو کہ مغلیہ دور میں موجود تھے، ان کی تفصیل آئین اکبری سے نقل ہے۔

۱- گروہ حبیبیاں اپنی نسبت حبیب عجمیؒ سے کرتا ہے، یہ بزرگ مال دار تھے، اپنی زندگی منافقت کے ساتھ بسر کرتے تھے، سہروردیؒ کی صحبت سے قدرے ان کی چشم بصیرت وا ہوئی اور بعد ازاں انہوں نے حسن بصریؒ کی خدمت میں ہدایت پائی اور تکمیل حاصل کی، ایک کثیر جماعت نے ان سے عرفان کی دولت حاصل کی، ایک دن خواجہ حسن بصریؒ حجاج کے چاؤشوں سے بھاگ کر حبیب عجمیؒ کے عبادت خانے میں داخل ہوگئے، سرہنگوں نے حبیب عجمیؒ سے پوچھا کہ حسن کہاں

ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ عبادت خانے میں ہیں، پیادوں نے خواجہ حسن بصریؒ کو عبادت خانے میں تلاش کیا لیکن وہاں ان کو نہ پایا، انہوں نے حبیب عجمیؒ کو جھڑکا اور خفا ہو کر کہنے لگے کہ حجاج جو فعل تم لوگوں کے ساتھ کرتا ہے تم لوگ اسی کے قابل ہو، حبیب عجمیؒ نے جواب دیا کہ میں نے بجز سچ کے اور کچھ نہیں کہا، اگر تم ان کو نہ دیکھو تو اس میں میرا کیا قصور ہے، پیادے دوبارہ عبادت خانے میں داخل ہوئے اور خواجہ حسن بصریؒ کو تلاش کیا اور نہ پایا، سرہنگ غصہ ہو کر واپس ہوئے اور حبیب عجمیؒ پر طنز کرتے ہوئے چلے گئے اور خواجہ حسن بصریؒ باہر تشریف لائے اور حبیب عجمیؒ سے ارشاد فرمایا کہ اے حبیب تو نے عمدہ و بہتر طریق سے حق استادی کو نگاہ میں رکھا، حبیب عجمیؒ نے جواب دیا کہ اے استاد، آپ نے میری راست گوئی کی وجہ سے رہائی پائی، اگر میں جھوٹ بولتا تو دونوں ہلاک ہو جاتے۔

۲- گروہ طیفوریاں، طیفور شامیؒ سے وابستہ ہے، ان کی کرامات مشہور ہیں، روایت ہے کہ ایک دن رات کے وقت ایک اندھیرے مکان میں ایک سوئی ان کے ہاتھ سے گر گئی تو غیب سے روشنی پیدا ہوگئی، انہوں نے اپنا ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیا اور فرمایا کہ نہیں نہیں میں سوئی کو بجز چراغ کے اور کسی چیز سے ڈھونڈنا نہیں چاہتا۔

۳- گروہ کرخی کو معروف کرخیؒ سے فیض حاصل ہے، کہتے ہیں کہ ان کے والد آتش پرست تھے، امام رضاؒ کی خدمت میں پہنچے، اسلام قبول کیا اور ربانی کی خدمت پائی اور داؤد طائی کی صحبت میں پہنچے اور ریاضت وعبادت شروع کی، یہ اپنی صداقت شعاری وراست کرداری کی وجہ سے پیشوائے عالم بن گئے، سری سقطیؒ اور اکثر بزرگان دین نے ان سے فیوض حاصل کئے، ۲۰۰ھ میں انہوں نے رحلت فرمائی، اس وقت گبرو ترسا و یہود لاش کے گرد جمع ہوگئے اور ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ اپنے مذہبی قواعد کے مطابق ان کی تجہیز وتکفین کرے لیکن یہ امر کسی سے ممکن نہ ہو سکا، بہ وجہ اس کے کہ ان کا مشرب صلح کل تھا۔

۴- گروہ سقطیاں، سری سقطیؒ کا مقلد تھا، کنیت ان کی ابوالحسن ہے، یہ کار آگاہ عالی مرتبہ عارف کامل وصاحب اوصاف پسندیدہ تھے اور جنیدؒ اور اکثر بزرگان حق کے استاد اور حارث محاسبیؒ وبشر حافیؒ کے ہم عصر اور معروف کرخیؒ کے شاگرد ہیں، ان کی تعریف وتوصیف مجھ ناشناسا کی طاقت

سے باہر ہے، ۲۵۳ھ میں رحلت فرمائی۔

۵- گروہ جنیدیاں، سید الطائفہ جنید بغدادیؒ کا پیرو ہے، علی ہجویریؒ صاحب اسی مسلک سے منسلک تھے، کشف المحجوب کے بارہ صوفیا کے سلسلوں میں بھی اس کا ذکر ہے۔

۶- گروہ کازرونیاں، ابواسحاق بن شہریارؒ کے حلقہ ارادت سے وابستہ ہے، ان کے والد نے دین زرتشتی کو ترک کر کے اسلام کو اختیار کیا اور شیخ ابوعلی فیروز آبادیؒ سے فیض حاصل کیا اور دیگر بزرگان دین سے بھی ملاقات کی اور علوم ظاہر و باطن حاصل کئے، ۴۲۶ھ میں انہوں نے رحلت فرمائی۔

۷- گروہ طوسیاں کو علاء الدین طوسیؒ سے عقیدت و نیاز مندی حاصل ہے، ان کے اور شیخ نجم الدین کبریؒ کے برادرانہ تعلقات تھے۔

۸- گروہ فردوسیاں شیخ نجم الدین کبریؒ سے عقیدت رکھتا ہے، ان کی کنیت ابوالجناب اور نام احمد خیوقی اور لقب کبری ہے، انہوں نے شیخ اسماعیل قیصریؒ و عماد یاسرؒ و روزبہانؒ سے فیوض حاصل کئے اور علوم ظاہر و باطن میں مرتبہ بلند حاصل کیا، شیخ مجد الدین بغدادیؒ، شیخ سعد الدین جمونہ، شیخ رضی الدین علیؒ، باکمال جندیؒ، شیخ سیف الدین باخرزیؒ اور اکثر اولیا نے ان کی امداد سے سعادت جاوید حاصل کی، ۶۱۸ھ میں بہ ضرب شمشیر شہید ہو گئے۔

۹- گروہ سہروردیاں، شیخ ضیاء الدین ابوالنجیب عبدالقادر سہروردیؒ سے عقیدت رکھتا ہے، یہ علم ظاہر و باطن میں نہایت عالی مرتبہ تھے، ان کا نسب بارہ واسطوں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ پر منتہی ہوتا ہے، علم طریقت میں ان کو شیخ احمد غزالیؒ سے نسبت حاصل ہے، بے شمار تصانیف ان کی یادگار ہیں، من جملہ "آداب المریدین" ایک مشہور تصنیف ہے، ۵۶۳ھ میں رحلت فرمائی۔

۱۰- گروہ زیدیاں، شیخ عبدالواحد زیدؒ کا مقلد ہے۔

۱۱- گروہ عباسیاں، فضیل بن عیاضؒ کا ارادت مند ہے، کنیت ان کی ابوعلی کوفی ہے اور بعض کے نزدیک نسبت سکونت بخاری ہے، اس کے علاوہ نسبتیں مذکور ہیں، مرد اور بادرد کے درمیان گداگری کے لباس میں راہ زنی کرتے تھے لیکن اپنی نیک فطرتی کی وجہ سے بیدار ہوئے اور اپنے پسندیدہ اعمال سے سعادت جاوید حاصل کی، ۱۸۷ھ میں انہوں نے رحلت فرمائی۔

۱۲- گروہ ادہمیاں، ابراہیم ادہم بلخیؒ کو اپنا پیشوا تسلیم کرتا ہے، حضرت کی کنیت ابواسحاق ہے، ان کے بزرگ ابتدا سے صاحب حکومت تھے، عالم جوانی میں ان کا ستارہ اقبال چمکا اور تمام اشیا سے دست بردار ہو گئے، یہ سفیان ثوریؒ و فضیل بن عیاضؒ و ابویوسف غسویؒ کے ہم نشین تھے، علی بکارؒ و حذیفہ مرعشیؒ اور مسلم خواص یاران جلسہ تھے، ۱۶۱ھ یا ۱۶۲ھ میں ملک شام میں انہوں نے رحلت فرمائی۔

۱۳- گروہ ہبیریاں، شیخ ہبیرہ بصریؒ کا پیرو ہے۔

۱۴- گروہ چشتیاں کو شیخ ابواسحاق شامیؒ سے ارادت حاصل ہے، شیخ ابواسحاقؒ قصبہ چشت میں تشریف لائے ابوخواجہ ابواحمد ابدالؒ سرگروہ مشائخ چشت نے ان سے تعلیم پائی، خواجہ ابواحمد ابدالؒ کے بعد ان کے فرزند شیخ محمد صالح نے چراغ ولایت روشن کیا، پھر خواجہ سمعانیؒ ان کے بھانجے ولی کامل ہوئے، اس کے بعد خواجہ مودود چشتیؒ نے معرفت کامل حاصل کی اور خواجہ مودودؒ کے فرزند احمد بھی عارف کامل ہوئے، فقر و درویشی پر ہر دو سلاسل مذکورہ کا انحصار نہیں ہے بلکہ جس برگزیدہ حق نے خدا کی پرستش سے اپنے نفس امارہ کو مردہ کر لیا، ان کے معنوی فرزند یکے بعد دیگرے اس چراغ آگہی کو روشن کرتے رہے، یہی اصل وجہ ہے کہ سلاسل جداگانہ قائم ہو گئے، اسی وجہ سے ان بارہ اور چودہ سلاسل کے علاوہ بھی بے شمار سلسلے زبان زد روزگار ہیں، جیسے قادری۔

۱۵- قادری سلسلہ شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کا پیرو ہے، یہ سعید حسنی الحسینی ہیں، جیلان ایک قریہ بغداد کے قریب واقع ہے اور ایک جماعت ان کو گیلانی کہتی ہے، یہ علوم ظاہر و باطن میں یگانہ روزگار تھے، انہوں نے خرقہ خلافت شیخ ابوسعید مبارکؒ سے پایا، ان کا شجرہ بیعت چار واسطوں سے حضرت شبلیؒ تک پہنچتا ہے، ان کی بزرگی و کرامات نے تمام عالم کو ان کا گرویدہ بنالیا، یہ ۴۷۱ھ میں عالم وجود میں آئے اور ۵۶۱ھ میں رحلت فرمائی۔

۱۶- گروہ لیسوئی علم حقیقت میں خواجہ لیسوئی کا تربیت یافتہ ہے، خواجہ احمد لیسوئی جب لڑکپن کے زمانے میں تھے تو باب ارسلانؒ نے ان کو ولی کامل بنا دیا، جب باب ارسلانؒ نے رحلت فرمائی تو انہوں نے خواجہ ابویوسف ہمدانیؒ سے کمال حاصل کیا، ترک ان کو آتا لیسوئی کہتے

ہیں جس کا معنی باپ ہے اور ترک اولیاء اللہ کو اسی لفظ سے مخاطب کرتے ہیں۔

۱۷- گروہ نقشبندی نے خواجہ بہاؤالدین نقشبندیؒ سے دولت ولایت حاصل کی، ان کا نام محمد بن منحر بخاری ہے، سب سے پہلے خواجہ بہاؤالدین نقشبندؒ پر خواجہ محمد بابا سماسیؒ کی نظر عنایت ہوئی اور انہوں نے بہ ظاہر تعلیم آداب طریقت کی سید امی کلالؒ سے جو خواجہ محمد بابا سماسیؒ کے خلیفہ تھے، حاصل کی۔ (۱۲)

برصغیر پاک و ہند میں جو سلسلے مشہور ہوئے، ان میں قادری، سہروردی، نقشبندی اور چشتی شامل ہیں، اگرچہ یہ سلسلے ہندوستان آنے سے پہلے ہی اپنا وجود رکھتے تھے لیکن ان کو جو شہرت ہندوستان اور پاکستان میں ملی وہ کسی اور جگہ حاصل نہیں ہوئی، برصغیر میں اسلام کی تبلیغ میں ان کا کردار بڑی اہمیت کا حامل ہے، برصغیر میں جب تک مسلمانوں کی حکمرانی رہی تمام سلاطین اور بادشاہوں نے ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور بعض ان کے پیروکار بھی رہے، مثلاً سلطان شمس الدین التمش، حضرت معین الدین چشتیؒ کا انتہائی عقیدت مند تھا جب حضرت صاحب دہلی تشریف لائے تو یہ خبر سن کر سلطان شمس الدین التمش ان کے استقبال کے لئے دہلی سے باہر گیا، مغلیہ دور کے حکمراں جلال الدین کو بھی ان سے بڑی عقیدت تھی، اکبر نے کئی بار ان کے مزار پر حاضری دی اور ان کے خلیفہ شیخ سلیم چشتی جو اکبر کے دور میں بہ قید حیات تھے کی خدمت میں کئی دفعہ پیدل حاضری دی، دیگر سلسلوں سے بھی سلاطین اور بادشاہوں کو ارادت تھی، برصغیر میں یہ سلسلے کس طرح پھیلے اور مقبول ہوئے اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

۱- چشتی: برصغیر میں یہ سلسلہ حضرت معین الدین اجمیریؒ کی بہ دولت بہت مشہور ہوا، یہ سلطان محمود غزنوی کے دور حکومت میں ۵۸۸ھ میں اجمیر تشریف لائے اور ۶۳۳ھ میں اجمیر میں وفات پائی، ان کا سلسلہ ان کے دو خلفا خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور شیخ حمید الدین ناگوریؒ کے ذریعے برصغیر میں بہت پھیلا، ان کے پیروکار برصغیر کے طول و عرض میں پھیلے بلکہ اس سے مزید چھوٹے چھوٹے سلسلے پیدا ہو گئے۔

اس سلسلے کے پیروکار کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے الا اللہ پر زیادہ زور دیتے ہیں بلکہ ان الفاظ کو دہراتے ہوئے اور جسم کے بالائی حصے کو ہلاتے ہیں، ان کے ہاں سماع کو خاصی اہمیت

حاصل ہے، چشتی درویش رنگ دار کپڑے پہنتے ہیں لیکن بعض پیروکار ہلکے بادامی رنگ کو ترجیح دیتے ہیں۔

۲- سہروردی: برصغیر میں اس سلسلہ کا آغاز شیخ بہاؤالدین زکریا سے ہوا، ان کے آباواجداد خوارزم کے رہنے والے تھے، ان کی ولادت کوٹ کروڑ میں ۱۱۷۲ء میں ہوئی اور وفات ۱۲۶۲ء، (۶۶۱ھ) میں ہوئی، ان کا مزار ملتان کا سب سے زیادہ مشہور مزار ہے۔

اس گروہ کے پیروکار شریعت کی پابندی زیادہ محتاط طریق سے کرتے ہیں، یہ سماع پر کم زور دیتے ہیں، ان کے ہاں سانس بلند کر کے اللہ کا ورد کرنے کا رواج عام ہے، یہ ذکر جلی اور خفی دونوں کے قائل ہیں۔ (۱۳)

۳- قادری: برصغیر میں اس سلسلہ کا آغاز حضرت مخدوم گیلانی سے ہوا، یہ حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی بغدادیؒ کی اولاد سے تھے، انہوں نے اپنی تعلیمات کا مرکز اچھ کو بنایا، انہوں نے اچھ میں ہی وفات پائی، ان کا مزار اچھ میں ہی ہے، انہوں نے ۱۵۱۷ء میں وفات پائی، عبدالحق محدث دہلویؒ کا تعلق اسی سلسلہ سے تھا، اس سلسلہ کے پیروکار سماع کا بہت کم شوق رکھتے ہیں، قادری درویش عموماً سبز رنگ کی پگڑی پہنتے ہیں اور لباس کا کوئی نہ کوئی حصہ ہلکے بادامی رنگ کا ہوتا ہے، ان کے ہاں درود شریف کی بڑی اہمیت ہے، ان کے ہاں بھی ذکر جلی و خفی دونوں جائز ہیں۔ (۱۴)

۴- نقشبندی: اس سلسلے کے بانی حضرت خواجہ محمد باقی اللہ ہیں، یہ ۱۵/ جولائی ۱۵۶۳ء میں کابل کے صوبے توران میں پیدا ہوئے، بعد میں دہلی میں آباد ہوئے، انہوں نے ۲/ دسمبر ۱۶۰۳ء میں دہلی میں وفات پائی، مزار بھی دہلی میں ہے۔

شیخ احمد سرہندی نے اس سلسلہ کو باقاعدہ طور پر فلسفیانہ رنگ دیا، چشتی، سہروردی اور قادری سلسلہ کے پیروکار وحدت الوجود کے قائل ہیں، جب کہ نقشبندی وحدت الشہود کے قائل ہیں، نقشبندی احکام شریعت کی سختی سے پابندی کرتے ہیں، جب کہ مذکورہ تین سلاسل میں سختی نہیں ہے، نقشبندی ذکر جلی کے خلاف ہیں، یہ صرف ذکر خفی کے قائل ہیں، یہ موسیقی اور سماع کے بھی خلاف ہیں، مراقبہ میں سر جھکائے آنکھیں بند کر کے بیٹھتے ہیں، مرشد اپنے مریدوں سے الگ نہیں

بیٹھتا بلکہ حلقے میں ان کا شریک ہوتا ہے اور توجہ الی الباطن سے ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ (۱۵)

برصغیر میں چند چھوٹے چھوٹے سلسلے بھی پائے جاتے ہیں:

۱- شطاری سلسلہ: اس سلسلہ کے بانی شیخ عبداللہ شطاریؒ ہیں، یہ اپنے مرشد کی درخواست پر ہندوستان تشریف لائے اور ۱۵۷۲ء میں وفات پائی، ان کا مزار مالدہ کے سابق دارالخلافہ مانڈو میں قلعہ کے اندر ہے۔ (۱۶)

۲- سلسلہ مداریہ: یہ سلسلہ ہندوستان میں شاہ بدیع الدین مدارؒ کی وجہ سے شروع ہوا، ان کا مزار قنوج کے نواح میں موضع مکن پور میں ہے، اخبار الاخیار کے مطابق ہرمز سے کالپسی آئے۔

۳- روشنیہ: یہ سلسلہ بایزید انصاریؒ المعروف پیر روشن میاں سے شروع ہوا، یہ ۱۵۲۵ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے، پھر اپنے والد صاحب کے ساتھ کوہستان چلے گئے، پھر افغانستان کے مختلف علاقوں سے ہوتے ہوئے پشاور آگئے، ان کی مغلوں سے نہ بنتی تھی، وفات ۱۵۷۲ء میں ہوئی، مغلوں کی وجہ سے یہ فرقہ زوال پذیر ہوا۔

۴- صابریہ سلسلہ: اس کے بانی مخدوم علاء الدین علی احمد صابرؒ ہیں جو حضرت بابا فریدؒ کے خلفا میں سے تھے (۱۷)، انہوں نے ۱۲۹۱ء میں وفات پائی، ان کا مزار کلیر شریف میں ہے، یہ مقام سہارن پور میں واقع ہے۔ (۱۸)

برصغیر میں عہد سلاطین، صوفیا کا عہد زریں تصور کیا جاتا ہے (۱۹)، جس میں صوفیا اہلِ علم حضرات پر زیادہ تر مشتمل ہوتے تھے، جس طرح حضرت معین الدین اجمیریؒ حافظ قرآن اور شاعر بھی تھے، پھر خواجہ بختیار کاکیؒ، خواجہ نظام الدین اولیاؒ اور دیگر صوفیائے کرام علم شریعت میں کمال رکھتے تھے لیکن بعد میں ان کے پیروکاروں میں علم شریعت ماند پڑ گیا، اس کے نتیجے میں ہندو جوگیوں کے اثرات ان میں عود کر آئے۔ مغل دور حکومت کے آغاز میں صوفیا کی بڑی تعداد فلسفیانہ انداز میں وحدت الوجود کی قائل ہوگئی، یوں مسلمانوں میں ایسے فرقے پیدا ہوگئے جن کے نزدیک صوفیانہ اسلام اور ہندومت میں کوئی خاص فرق نہ تھا، اس قسم کے خیالات کی ترجمانی اکبر کی ''صلح کل'' کی پالیسی میں ملتی ہے، اکبر کے پوتے شہزادہ محمد داراشکوہ نے اپنی کتاب ''مجمع البحرین'' لکھی

ہے، اس غرض سے تھی کہ اسلام اور ہندومت میں جو اقدار مشترک ہیں ان کا بیان کیا جائے جیسا کہ اس نے اس کتاب کے شروع میں لکھا ہے۔

''جب اس خاکسار کو حقیقت الحقائق اور صوفیائے کرام کے مذہب برحق کے رموز و دقائق معلوم ہوگئے اور اس نعمت عظمیٰ (ولایت) سے یہ فقیر مشرف ہوگیا تو میں اس بات کے درپے ہوا کہ ہندو فقرا (جوگیوں) کا مشرف اور طریقہ بھی دریافت کروں، چنانچہ اس قوم (جوگیوں) کے بعض محقق کاملوں کے فیض صحبت سے بارہا فیض یاب ہوا اور حق شناسی کے متعلق ان سے مکرر گفتگو ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے ان بزرگوں (جوگیوں) کو نہایت ریاضت کش، بڑے سمجھ دار اور خدا رسیدہ پایا اور حق شناسی اور معرفتِ الٰہی کے متعلق صوفیا کرام اور جوگیوں میں سوائے لفظی اختلاف اور نزاع کے اور کوئی فرق مجھے معلوم نہیں ہوا لہذا میں نے فریقین (صوفیوں اور جوگیوں) کے کلام میں مطابقت پیدا کر کے اور بعض اہم باتیں جمع کر کے ایک رسالہ مرتب کیا، چوں کہ یہ رسالہ ہر دو گروہ کے حقائق و معارف کا مجموعہ ہے، اس لئے میں نے اس رسالے کا نام مجمع البحرین رکھا''۔ (۲۰)

اس کے بعد اس نے لکھا کہ

''تحقیق حق وہی ہے کہ جو میں نے اس رسالے میں بیان کیا ہے یعنی صوفیائے اسلام و جوگیاں اہل ہنود کا معرفتِ الٰہی میں متحد ہونا''۔ (۲۱)

مزید یہ بھی لکھا ہے کہ

''اس رسالے میں صوفیائے اسلام اور جوگیان ہند کے جس متحدانہ تصوف کی میں نے تحقیق کی ہے، کشف صحیح کے مطابق محض اپنے اہل بیت (متعلقین) کی خاطر اسے قلم بند کیا ہے، مجھے فریقین کے عوام اور اہل ظاہر سے کوئی تعلق نہیں''۔ (۲۲)

داراشکوہ نے اپنے رسالے میں اسلام اور ہندومت میں مشترک اقدار کو بائیس عنوانات کے تحت گنوایا ہے، سب سے پہلے کائنات کے عناصر ترکیبی کے بارے میں تحریر کیا ہے، اسلامی نظریے کے مطابق تمام مادی مخلوقات کا ظہور پانچ عناصر سے ہوا: ۱- عرشِ اکبر، یہ عنصرِ اعظم ہے، ۲- عنصر ہوا، ۳- عنصر آتش، ۴- عنصر آب، ۵- عنصر خاک، پھر لکھا ہے کہ ان پانچوں عناصر کو

ہندی میں "پانچ بھوت" کہتے ہیں: ۱- آکاس جس نے تمام عناصر کو گھیرے میں لے رکھا ہے، ۲- بائی، ۳- تیج، ۴- جل، ۵- پرتھی۔ (۲۳)

اس کے بعد دوسرے عنوان میں حواس کو بیان کیا، عناصر کی طرح حواس بھی پانچ ہیں: ۱- شامہ، ۲- ذائقہ، ۳- باصرہ، ۴- سامعہ، ۵- لامسہ، ان حواس خمسہ کو ہندی زبان میں "پنچ اندری" کہتے ہیں، ۱- گھران (قوت شامہ)، ۲- رسنا (قوت ذائقہ)، ۳- چچھو (قوت باصرہ)، ۴- سروتر (قوت سامعہ)، ۵- توک (قوت لامسہ) اور جو اشیا حواس خمسہ سے محسوس ہوتی ہیں، ان کو ہندی زبان ۱- گندھ (سونگھی ہوئی چیز)، ۲- اس (چکھی ہوئی چیز)، ۳- روپ (دیکھی ہوئی چیز)، ۴- سبد (سنی ہوئی چیز) اور ۵- سپرس (چھوئی ہوئی چیز) کہتے ہیں (۲۵)، اس طرح شغل، صفات الٰہی، روح، ہوا یا عالموں کا بیان آواز زر کی حقیقت، دیدار الٰہی، اسمائے الٰہی، نبوت اور ولایت برہمانہ (گنبد کی شکل میں خدا کا ظہور) جہاں (طرفین)، آسمان، زمین، عالم برزخ، قیامت، مکتی (نجات)، دن اور رات اور زمانہ کی بے انتہائی، ان ابواب کے ضمن میں دارا شکوہ نے تفصیل کے ساتھ اقدار مشترک بیان کی ہیں۔ (۲۶)

دارا شکوہ کی اس کاوش کا مقصد سیاسی نظر آتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے وہ سیاسی طور پر ہندوؤں کی حمایت حاصل کرنا چاہتا تھا، تاہم جن باتوں کا اس نے ذکر کیا ہے وہ ہمارے موضوع کے حوالے سے بڑی اہم ہیں، کیوں کہ اس قسم کے خیالات صوفیا میں اس وقت رواج پا چکے تھے، جو کہ مسلمانوں کے ذہنی انتشار کا باعث بنے،، وحدت الوجودی خیالات اس ذہنی انتشار کا سب سے بڑا سبب تھے، پندرہویں، سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں برصغیر میں جو مذہبی تحریکیں چلیں وہ سب اس مذہبی انتشار کی وجہ سے رونما ہوئیں اکبر کا "دین الٰہی" اس قسم کے ذہنی انتشار کی ایک شکل ہے، چنانچہ اکبر نے "صلح کل" کی پالیسی کو اپنانا ہی بہتر سمجھا، دارا شکوہ کی یہ کاوش بھی اکبری صلح کل کی پالیسی کو فلسفیانہ انداز میں بیان کرنے کی ایک اور کاوش ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی نے اس ذہنی انتشار اور اکبر کے الحاد کے خلاف آواز اٹھائی، حضرت کا تعلق نقشبندیہ سلسلے سے تھا اس لئے صوفیا کو اسلام کے قریب رکھنا نقش بندیوں کا بڑا کارنامہ ہے۔

شیخ محمد اکرام نے اپنی کتاب "رود کوثر" میں حضرت مجدد الف ثانی کی خدمات کو یوں قلم بند کیا ہے۔

"حضرت مجدد الف ثانی کی ایک اہم اسلامی خدمت یہ ہے کہ آپ نے اس سلسلۂ تصوف کی اشاعت کی جو ہندوستانی طریقوں میں شریعت سے قریب ترین ہے، ہندوستان میں شروع ہی سے اسلام پر تصوف کا رنگ اس قدر چڑھا ہوا ہے کہ بیسویں صدی کے شروع تک کسی کو یہ خیال بھی نہ ہوتا تھا کہ کسی صوفیانہ سلسلے میں داخل ہوئے بغیر انسان اسلام کی برکات سے مستفید ہو سکتا ہے، ایسی حالت میں اسلام کی بڑی خدمت اسی میں تھی کہ ایسے صوفیانہ سلسلے کو ترقی دی جائے جو بعض دوسرے سلسلوں کی طرح شروع سے آزاد نہ ہو، حضرت مجدد نے یہی کیا اور ہندوستان کے مشہور اور پرانے سلسلوں کو چھوڑ کر ایک ایسے طریق کی اشاعت کی جس میں شرع اسلام کی پیروی پر بڑا زور ہے، "جواہر مجددیہ" کے مصنف لکھتے ہیں کہ "اس طریق کے تمام اصول اور فروع میں اتباع سنت سنیہ اور اجتناب بدعات نامرضیہ بہ درجہ کمال ہے"، اصحاب کبار جیسا لباس مشروط ہے، ان ہی کی سی معاشرت، ویسے ہی کم ریاضتیں اور فیضان کثیر اور کمالات ولایت کے علاوہ کمالات نبوت کی بھی تعلیم ہے، نہ اس میں چلہ کشی کی ضرورت ہے نہ ذکر بالجہر کی اجازت ہے، نہ سماع بالمزامیر ہے، نہ قبور پر روشنی، نہ غلاف و چادر اندازی، نہ ہجوم عورات، نہ سجدہ تعظیمی، نہ سر کا جھکانا نہ بوسہ دینا نہ توحید وجودی و دعوائے انا الحق و ہمہ اوست نہ مریدوں کو پیروں کی قدم بوسی کا حکم، نہ مرید عورتوں کی ان کے پیروں سے بے پردگی"۔ (۲۷)

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے نہ صرف طریقت کا وہ سلسلہ اختیار کیا جس میں شرعی احکام کی پاس داری تھی بلکہ اس سلسلے میں طریقت سے زیادہ شرع کو اہمیت دی گئی، حضرت کے کئی ارشادات ایسے ہیں جن میں آپ تعلیم دینی کو تعلیم سلوک پر مقدم رکھتے تھے اور صحابہ کرام کو تمام اولیا سے بزرگ مانتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ حال تابع شریعت ہے نہ شریعت تابع احوال ہے، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جب دیکھا کہ صوفیائے متقدمین کے کلام کی خلاف شرع ترجمانیاں ہوتی ہیں تو اپنے مکتوبات میں تشریح اور تاویل کر کے انہیں شرع کے مطابق ثابت کیا، مشائخ متاخرین بعض خلاف شرع امور کو روا رکھتے تھے، حضرت فرماتے تھے کہ وہ لازم الاتباع نہیں۔

حضرت مجدد نے عقیدہ وحدت الوجود کی نئی توجیہ کی اور وحدت الشہود کا نظریہ قائم کر کے مسلمان صوفیا اور علما کے اختلافات دور کر دیے، ان کا قول ہے کہ مقام وحدت الوجود سالک کو ابتدائے سلوک میں پیش آتا ہے، جس سے اسے گزر جانا چاہیے اور جو شخص اس سے بالاتر مقام پر عروج کرتا ہے، اس مقام پر وحدت الشہود منکشف ہوتا ہے جو شرع کے عین مطابق ہے۔

ان کا سب سے بڑا کام رد بدعت تھا، نئے فرقوں اور نئے طریقوں سے نہ صرف دین میں رخنے پیدا ہوتے تھے بلکہ اسلامیان ہند کے اجتماعی نظام میں بھی انتشار پیدا ہوا تھا، انہوں نے رد بدعت کی پوری کوشش کی، اس زمانے میں صفویوں کی وجہ سے شیعیت ایران میں عروج پر آئی اور چونکہ ایران سے عہد مغلیہ میں گہرے روابط قائم ہوگئے تھے، ہندوستان میں بھی شیعہ اثرات بڑھنے لگے، حضرت نے ان کو روکنے کے لئے زبان اور قلم سے کام لیا، مہدویت کی بھی انہوں نے مخالفت کی اور تصوف میں بھی بدعتوں کے خلاف آواز اٹھائی، ان کی اس کاوش کے نتیجے میں حکمراں طبقے میں جو اسلام پسند گروہ تھا اسے تقویت ملی اور جو غیر اسلامی آداب و رسوم دربار شاہی میں عجمی ملوکیت کی تقلید میں ہندو اثرات کی وجہ سے رائج ہوگئی تھیں ان کے ازالے کا سامان ہوا اور شعائر اسلامی کے احترام کا پھر سے خیال کیا جانے لگا، آگے چل کر یہ تحریک سیاسی طور پر اورنگ زیب کی صورت میں نمودار ہوئی اور مذہبی لحاظ سے شاہ ولی اللہؒ کی صورت میں مزید آگے بڑھی۔

چند سلسلے ایسے بھی ہیں جو خالصتاً برصغیر پاک و ہند کی پیداوار ہیں جیسے طریقہ مداریہ، طریقہ قلندریہ، طریقہ شطاریہ، پھر یہ طریقے برصغیر سے باہر گئے۔(۲۸)

محققین نے تصوف کے بارے میں بہت سی کتب لکھی ہیں اور ان کتب میں اپنی آرا کو اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے، چنانچہ صوفی کی تعریف میں ایک گروہ نے کہا کہ جو شخص صوف (اون) کا لباس زیب تن کرتا ہے وہ صوفی کہلاتا ہے، دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ صوفی وہ ہے جسے قرب الٰہی حاصل ہو، تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ جس شخص کو اصحاب صفہؓ سے محبت و تعلق ہو وہ صوفی کہلاتا ہے، ایک گروہ کا خیال ہے کہ صوفی صرف ایک اسم ہے، جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

اگر ہم مسلم فکر کا عمیق جائزہ لیں تو اس فکر میں صوفیا کے خیالات اور نظریات کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، تصوف کے آغاز اور اس کے بارے میں بنیادی معلومات سے

روشناس ہونا ایسا ہے جیسا کہ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی روح سے آشنا ہونا۔

تصوف اپنے وسیع تر مفہوم میں سریت یعنی یہ ایک مخصوص رجحان کا نام ہے، جس کا تعلق کسی خاص علاقہ، قوم یا مذہب کے ماننے والوں سے نہیں ہے، فلسفے کی طرح اس کی حیثیت بھی عالم گیر ہے، تمام بنی نوع انسان میں یہ رجحان پایا جاتا ہے اور فلسفے کی طرح یہ بھی حقیقت مطلقہ کی تلاش میں ہے، البتہ ان دونوں کا طریقہ کار مختلف ہے، فلسفہ حقیقت مطلقہ کو عقل کے ذریعے سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے جب کہ تصوف میں حقیقت مطلقہ کو جاننے کے لئے وجدان، عشق اور جذبے کا سہارا لیا جاتا ہے، اس کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ ایک دفعہ ابن سینا جو بنیادی طور پر عقلیت پسند تھے، اسرار کائنات کے بارے میں منطقی استدلال کے ساتھ بات کر رہے تھے، ابو السعید ابن ابو الخیر خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہے تھے، جب ابن سینا نے اپنی بات مکمل کر لی تو ابو السعید نے فقط اتنا کہا کہ آپ جو کچھ جانتے ہیں میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ علامہ اقبال نے بڑی خوب صورت بات کہی ہے کہ "معرفت" عقل و خرد سے نہیں بلکہ عشق و وجدان سے حاصل ہوتی ہے، صوفیا اسی طریقہ کو اختیار کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں ان میں مجاہدہ و ریاضت کی رغبت پیدا ہو جاتی ہے، اس سے قبل کہ تصوف پر سیر حاصل بحث کی جائے، یہ جاننا ضروری ہے کہ خود اہل تصوف نے اس کی کیا تعریف کی ہے۔

حضرت ذو النون مصریؒ کے نزدیک "صوفی جب بولتا ہے تو اس کی گفتگو کا بیان اس کی حقیقت حال کے مطابق ہوتا ہے اور جب خاموش رہتا ہے تو اس کا معاملہ اس کی حالت سے ظاہر ہوتا ہے"، حضرت جنیدؒ کے نزدیک "تصوف ایک ایسی صفت ہے جس میں بندہ قائم ہے"، حضرت ابو الحسن نوریؒ کے خیال میں "نفس کی تمام لذتوں کو چھوڑ دینا تصوف ہے"، حضرت محمد ابن علی بن حسین بن علی ابن ابی طالب فرماتے ہیں کہ "تصوف خوش خلقی کا نام ہے"۔

صوفیا کی قلبی واردات کی دو اقسام ہیں ایک کو احوال کہتے ہیں اور دوسری کو مقامات، احوال میں محبوب حقیقی کا جلوہ دکھائی دیتا ہے اور مقامات میں عاشق الٰہی اپنے معشوق حقیقی سے خلوت میں ہم کنار ہوتا ہے، ہمارے نزدیک تصوف پر مستند شخصیت مولانا روم ہیں، انہوں نے تصوف کو بڑی خوب صورت تشبیہ میں بیان کرتے ہوئے دلہن کی مثال دی ہے، فرماتے ہیں کہ

عروس کا جلوہ تو نوشہ کے علاوہ دوسروں کے لئے جنت نگاہ بن سکتا ہے لیکن خلوت صرف نوشہ کو نصیب ہوتی ہے۔

حال چوں جلوہ است زاں زیبا عروس   ویں مقام آں خلوت آمد با عروس (۲۹)

مولانا روم فرماتے ہیں کہ عشق الٰہی جس سے محبت مخلوق وابستہ ہے دراصل دین کا جوہر ہے اور یہی اصل تصوف ہے۔

جدید فلاسفہ میں کانٹ وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ کہا کہ مابعد الطبعیاتی مسائل کا حل عقل سے نہیں بلکہ سریت کے خالصتاً شعوری پہلو سے ممکن ہے۔ (۳۰)

قرآن پاک نے اس کے متبادل کے طور پر ایمان بالغیب کی اصطلاح استعمال کی ہے، ایمان بالغیب دراصل اللہ تعالیٰ سے وہ لطیف تعلق ہے جو قرآن پاک کے بیان کردہ تمام ذرائع علم میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی میسر نہ ہو تو مشاہدہ و تجربہ یا عقل و استدلال منزل تک نہیں لے جاسکتے، بلکہ ایسی صورت حال میں قرآنی آیات تک سے گمراہی کا خدشہ ہوسکتا ہے، چنانچہ سریت نے بالعموم اور تصوف نے بالخصوص روحانی اور اخلاقی زندگی میں اہم کردار ادا کیا ہے، بلکہ ان میں مابعد الطبعیاتی مسائل کے حل کی صلاحیت بھی موجود ہے،

مسلمانوں میں صوفیانہ رجحانات کا آغاز اصحاب صفہ کی طرز زندگی سے ہوا، انہوں نے روحانی زندگی کی بلندی کے لئے ذکر الٰہی اور عبادت پر زور دیا اور اس کی تلقین کی، اگرچہ یہ مثبت لائحہ عمل تھا لیکن آگے چل کر اس کے خلاف منفی رجحانات نے جنم لیا اور بنو امیہ کے عہد میں ان منفی رجحانات کو بھی تقویت ملی، یہ دور سیاسی کشمکش کا تھا، اس میں اقتدار کی حرص میں اضافہ ہوا جس کے نتیجہ میں اسلامی تعلیمات کے جذبہ میں کمی واقع ہوئی، چنانچہ عام لوگوں کی توجہ روحانی ترقی سے ہٹ کر کاروبار حیات کی طرف مبذول ہوگئی، خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی تھی اس صورت حال کے باعث بھی نیکوکار لوگوں نے خاموشی اور گوشہ نشینی اختیار کی، حسن بصریؒ، حبیب عجمیؒ، جنید بغدادیؒ اور بایزید بسطامیؒ وغیرہ مسلمان صوفیا اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔

بعض روایات کے مطابق یہ تصور غیر اسلامی اثرات کا مرہون منت ہے، تاہم یہ بات درست نہیں ہے کیوں کہ قرآن پاک میں خود نبی پاک ﷺ کی طرز زندگی میں تصوف کے بارے میں

واضح اشارات ملتے ہیں، اسلام میں تقویٰ، توکل، توبہ وغیرہ پر اس قدر زور دیا گیا ہے گویا یہی وہ بنیادی عناصر ہیں جن سے تعمیر سیرت ہوتی ہے۔

قرآن پاک میں ایسی حکمتوں کا ذکر بھی ملتا ہے جن سے باطنیت کا جواز ملتا ہے، ارشاد ربانی ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (۳۱)

وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں خود ان ہی میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیا جو ان کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اہل تصوف کے نزدیک اس حکمت سے مراد الفاظ کے اندر چھپی ہوئی معنویت کا ادراک ہے اور اس کی اہمیت اس قدر ہے کہ قرآن پاک نے اس کو خیر کثیر قرار دیا ہے، ارشاد خداوندی ہے:

مَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا۔ (۳۲)

جسے حکمت دی گئی اسے بہت بڑی بھلائی عطا کی گئی۔

مولانا روم کا خیال ہے کہ اس حکمت سے مراد عقل استدلالی سے وجدان کی طرف ترقی ہے، قرآن حکیم نے حکمت کو خیر کثیر کہا ہے اور انسانوں کو تلقین کی ہے کہ وہ عقل کو استعمال کریں اور تدبر و تفکر سے کام لیں، کائنات اور اس کے قوانین فطرت کا مطالعہ انسان کو بصیرت کی قدرت بخشتا اور اس کے اندر خلیفہ بننے کی صلاحیتیں پیدا کرتا ہے، ان کے بہ قول عقل کا انسان کے ساتھ ایک عجیب رشتہ ہے، انسان پہلے حکمت کا طلب گار ہوتا ہے اور بعد میں خود منبع حکمت بن جاتا ہے، اس کے حافظے کی لوح - لوح محفوظ بن جاتی ہے اور اس کی روح - روح القدس سے فیض یاب ہوتی ہے۔ (۳۳)

ان کا خیال ہے کہ انسان کے اس ارتقا میں پہلے عقل اس کی معلم ہوتی ہے لیکن آخر میں انسان معلم اور عقل شاگرد بن جاتی ہے کیوں کہ وجدان کی طرف سفر کرتے ہوئے ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جہاں استدلالی عقل کام نہیں دیتی، وہ کہتے ہیں کہ خشکی کی سواری پانی میں کام نہیں آتی بحر توحید میں وجدان بصیرت عقل استدلالی سے آگے بڑھ جاتی ہے جیسے کہ جبرائیل علیہ السلام نے ایک

مقام پر پہنچ کر معراج میں رسول کریم ﷺ سے عرض کیا کہ اب میں آگے نہیں بڑھ سکتا، اگر میں آگے بڑھا تو میرے پر جل جائیں گے:

اگر یک سر موئے برتر پرم   فروغ تجلی بسوزد پرم (۳۴)

اہل تصوف نے اپنے عقائد کی تائید میں درج ذیل آیات کا حوالہ دیا ہے:

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ. (۳۵)	وہی اول ہے، وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے اور وہی باطن اور وہ تمام چیزوں کو بہ خوبی جانتا ہے۔
وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ. (۳۶)	اور مشرق و مغرب سب اللہ کا ہے تم جس طرف رخ کرو ہر طرف اللہ کا چہرہ موجود ہے۔
اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. (۳۷)	اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔
وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى. (۳۸)	اور جس وقت (اے محمد ﷺ) تم نے کنکریاں پھینکی تھیں تو وہ تم نے نہیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں۔

قرآن پاک کے علاوہ اہل تصوف نے احادیث کا بھی حوالہ دیا ہے جن میں تصوف کی جھلکیاں ملتی ہیں، حدیث قدسی ہے:

"میرا بندہ مجھ سے قریب تر ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں اور جب میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے"۔ (۳۹)

قرآن پاک اور احادیث نبوی میں خدا کو خوف اور محبت دونوں کا سر چشمہ بتایا گیا ہے، اہل تصوف نے زیادہ زور محبت کے پہلو پر دیا ہے، اس حوالے سے انہوں نے کئی آیات کو اپنی تائید میں پیش کیا، محبت کے پہلو پر زور دینے ہی کا نتیجہ تھا کہ صوفیا میں انسانوں سے محبت کا نظریہ ایک مطلق اصول کے طور پر پیدا ہوا چنانچہ وہ نفرت کے بجائے محبت، جنگ کے بجائے امن وغیرہ پر

زور دینے لگے، تاریخ گواہ ہے کہ جس معاشرہ میں صوفیا کا زور رہا وہاں انسانی لڑائیاں ختم ہوگئیں۔

بابا فرید گنج شکرؒ ایک ممتاز صوفی گزرے ہیں، ان کی حکایات میں آتا ہے کہ ایک دفعہ مرید ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے شہر کا تحفہ قینچی لایا کیوں کہ اس کے شہر میں قینچی بنتی تھی، بابا فرید گنج نے مرید سے کہا، یہ کیسا تحفہ لائے ہو، قینچی کاٹتی ہے اگر تحفہ ہی لانا تھا تو سوئی دھاگا لاتے کیوں کہ سوئی کاٹے ہوئے کو جوڑنے کے کام آتی ہے۔

علامہ اقبال نے بھی اپنی نظم و نثر میں تصوف کے بارے میں بہت سی باتیں کہی ہیں:

ہو چکا گو قوم کی شان جلالی کا ظہور   ہے مگر باقی ابھی شان جمالی کا ظہور

صوفیا کے کردار کو ایک تمثیلی قصہ سے زیادہ بہتر طریقے سے سمجھا جاسکتا ہے، ایک دفعہ ایک صوفی کا قافلہ چل رہا تھا جس نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا وہاں درخت تھے، فاختہ کا ایک غول آیا اور درختوں پر منڈلانے لگا گویا وہ کسی بات پر احتجاج کر رہا تھا، صوفی نے فاختہ کے سربراہ سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ اس نے جواب دیا کہ آپ کے ایک بندے نے ہماری فاختہ کا شکار کیا ہے، صوفی نے اپنے مرید کو بلا کر پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ میں نے کیا غلط کیا ہے؟ جانور ہماری خوراک ہیں، ان کو مارنا ہمارے لئے حلال ہے، بزرگ نے مرید کا جواب فاختہ کے لیڈر تک پہنچادیا، اس نے کہا ہماری یہ شکایت نہیں، ہماری شکایت ہے کہ آپ لوگ صوفی بن کر یہاں آئے مگر آپ نے شکاریوں والا کام کیا، آپ کا صوفیوں کا روپ دیکھ کر ہم مطمئن ہوگئے، اگر آپ شکاری بن کر آتے تو ہم اپنے بچاؤ کا بندوبست کر لیتے۔

صوفیا کی یہی خصوصیت دور قدیم میں اسلام کی اشاعت کا باعث بنی، ان کی نسبت بادشاہ شکاری کے روپ میں آئے، چنانچہ لوگوں نے اپنی عافیت اسی میں جانی کہ ان شکاریوں سے دور ہی رہا جائے، اس طرح وہ اسلام سے بھی دور ہوگئے، اس کے برعکس صوفیا نے اپنے آپ کو بے ضرر پیش کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلم بھی حلقہ بہ گوش اسلام ہوئے، شاہ ولی اللہؒ نے اپنی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں لکھا ہے کہ ان کے والد صوفی تھے اور ان کے سامنے یہ شعر پڑھتے تھے:

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است   با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا (۴۰)

یعنی دونوں عالم کی راحت صرف دو الفاظ میں چھپی ہوئی ہے، دوستوں کے ساتھ نرمی

اور دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک، مشہور صوفی شاعر حافظ شیرازیؒ نے اہل تصوف کے نقطۂ نظر کو بڑے خوب صورت انداز میں اس شعر میں بیان کیا ہے۔

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم   از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

یعنی ہم نے سکندر اور دارا جیسے بادشاہوں کے قصے نہیں پڑھے، تمہیں پوچھنا ہے تو ہم سے صرف محبت اور وفا کی باتیں پوچھو۔

صوفیا کے حسن اخلاق سے معاشرہ میں امن ومحبت کی اقدار کو فروغ ملا، لوگ مل جل کر رہنے لگے اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان رقابت مٹنے لگی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی خوبیاں ان پر واضح ہوئیں اور وہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔

اگر ہم حضورﷺ کی حیات طیبہ کا مطالعہ کریں تو اس میں سادگی، عبادت، غار حرا کی خلوتوں میں فکر ومراقبہ، روزمرہ زندگی میں امانت، دیانت جیسے شاہ کار گوشے دیکھنے کو ملتے ہیں جن سے صوفیا کو بہت کچھ میسر آیا، تاریخ اسلام میں ہمیں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کے زیر اثر اسلام قبول کرنے والے اولین گروہ یعنی صحابہ کرامؓ کی سوچ مکمل طور پر بدل گئی تھی اور وہ زندگی کو اعلا مقاصد کے حصول کے لئے بسر کرتے تھے، صحابہؓ کے بعد تابعین کے ہاں بھی ان صفات کے حامل افراد کے تذکرے ملتے ہیں، اس سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تصوف اپنے ابتدائی دور میں خالصتاً اسلامی تعلیمات پر مبنی تھا۔

جس طرح اسلام کے دوسرے تصورات کو خارجی اثرات نے متاثر کیا، اسی طرح تصوف میں بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئے تصورات نے جنم لیا، غیر مسلم معاشروں میں اسلام قبول کرنے والوں کی سابقہ سوچ اور فکر سے مسلم معاشرے کا متاثر ہونا ایک فطری امر تھا، اس طرح جدید خیالات ونظریات نے جنم لیا، اسلام ایک عالم گیر دین ہے جو زندگی کے اجتماعی معاملات کے ساتھ ساتھ انفرادی معاملات کی بھی مکمل نگہداشت کرتا ہے، تصوف کی اس بدلی ہوئی شکل پر علما نے اعتراضات کئے، حتی کہ انہوں نے بعض اہل تصوف پر کفر کے فتوے بھی لگائے، تصوف میں غیر اسلامی رجحانات پر خود اہل تصوف نے بھی تنقید کی، ان میں سید علی ہجویریؒ، غزالی اور مجدد الف ثانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، انہوں نے خالص اسلامی تصوف کی روح پر

زور دیا، جن بیرونی عوامل نے اسلامی تصوف پر اثرات مرتب کئے ان میں نوفلاطونیت، بدھ مت اور مسیحیت کا نمایاں مقام ہے۔

فلسفۂ یونان پر جب دور انحطاط شروع ہوا تو عقلیت کی جگہ روحانیت نے لی، فلاطینوس نے ظاہر سے زیادہ باطن اور عقل سے زیادہ وجدان پر زور دیا، اس کا خیال تھا کہ منطقی فکر حقیقت مطلقہ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی، اس کے لئے روحانیت کی جانب سفر کرنا پڑتا ہے، وہ یہ سمجھتا تھا کہ طبعی علوم سے زیادہ کشف ووجدان کی اہمیت ہے، فلاطینوس کا خیال تھا کہ حقیقت مطلقہ سے لے کر مادی کائنات تک ایک تسلسل موجود ہے، خدا اپنی صفت ماورائیت کے باوجود ہر جگہ موجود ہے، وہ ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی، وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، وہ نظریہ صدور کا حامی تھا یعنی یہ کائنات خدا سے اسی طرح جاری وساری ہے جس طرح سورج سے شعاعیں نکلتی ہیں، کوئی شئے سورج سے جتنی دور ہوگی اسی قدر وہ کم روشن ہوگی، اسی طرح کوئی شئے جتنی خدا سے دور ہوگی اتنی ہی اس میں کثافت زیادہ ہوگی، اس کا خیال تھا کہ اگر ہم خدا تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم نیک کام ہی کریں بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ روح ہر طرح سے پاک ہو، اس مقصد کی خاطر اس نے ریاضت اور مجاہدہ پر زور دیا، صوفیا نے فلاطینوس کے نظریات کو قبول کیا، چنانچہ انہوں نے ایسے نظریات پر عمل کرنا شروع کیا جن کا اسلامی عقائد سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا، فلسفۂ یونان کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کرنے کی خاطر انہوں نے اسلامی عقائد کی ایسی تاویلیں کیں جو اسلام کے مزاج کے خلاف تھیں، اس پر رد عمل لازمی تھا، چنانچہ بعض صوفیا نے اس کے خلاف جہاد کیا۔

بدھ مت کے بانی مہاتما بدھ نے ترک دنیا اختیار کر کے ایک مثال قائم کی تھی، اس نے اپنے ارد گرد برپا ظلم وستم اور تکلیف ومصائب سے راہ فرار اختیار کیا اور سخت ریاضت، چلہ کشی نفس کی نفی اور غور وفکر سے نروان حاصل کیا، یوں ایک نئی روشنی سے فیض یاب ہونے کے بعد اپنے معاشرے میں واپس لوٹ آیا، اس نے لوگوں کو نیکی کی ترغیب دی، اس کی تعلیم میں جاذبیت موجود تھی، چنانچہ اس کے ماننے والوں میں اضافہ ہوتا گیا، آج بھی اس کے ماننے والے خاصی تعداد میں موجود ہیں، بدھ مت کی نمایاں تعلیمات میں یہ بات شامل ہے کہ یہ دنیا

دکھوں کا گہوارہ ہے، انسان کو اپنی نفسانی خواہشات کو قابو میں رکھنا چاہیے، وہ اپنے عقیدے کو درست کرے، اچھی گفتگو کرے، دیانت داری اور ایثار کا مظاہرہ کرے، بدھ مت کی تعلیمات میں نفس پرستی، لذت پرستی اور حب دنیا برائی کے سرچشمے ہیں۔

مسلمان صوفیا بھی ان تعلیمات سے متاثر ہوئے کیوں کہ ان باتوں کا ذکر ہمیں کسی نہ کسی حوالے سے اسلام میں بھی ملتا ہے، بعض صوفیا نے ترک دنیا اور نفس کشی پر اس قدر زور دیا کہ وہ ہدف تنقید کا نشانہ بنے کیوں کہ اسلام نے اعتدال پر زور دیا ہے۔

حضرت عیسیٰ کی زندگی سادگی کی ایک عمدہ مثال ہے، انہوں نے لوگوں کو لذات دنیوی سے کنارہ کش ہو کر نیکی کی راہ اختیار کرنے کی تلقین کی، ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر ان کے ماننے والوں نے رہبانیت کی راہ اختیار کی اور رہبانیت کو روحانی ترقی کا ذریعہ سمجھا، انجیل میں بھی خواہشات سے لاتعلقی کی تعلیم موجود ہے، چنانچہ عیسائیوں میں راہبوں کا ایک مستقل ادارہ معرض وجود میں آگیا، یہ لوگ اونی لباس پہنتے اور الٰہیات کی باتیں کرتے تھے، عام لوگ بھی اس میں جاذبیت محسوس کرنے لگے، چنانچہ مسلم صوفیا بھی ان سے متاثر ہوئے اور وہ بھی بحثوں میں دل چسپی لینے لگے۔

تصوف کے تعارفی جائزہ کے بعد ہم اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں، اسلام کا اصل مقصد بندے کے اندر قرب الٰہی کے حصول کی کوشش کو اجاگر کرنا ہے، اس حصول کا ۵۰ فی صد تعلق خارجی شریعت سے اور ۵۰ فی صد انسان کے اندر باطنی طلب ہے، شریعت بنیادی ڈھانچہ فراہم کرتی ہے، مگر قرب الٰہی کا تمام تر انحصار انسان کی اپنی روحانی طلب پر ہے، مثلاً قرآن پاک خدا کی کتاب ہے، اس کا ابتدائی علم ہمیں نبی پاک ﷺ کی تعلیمات سے ملتا ہے لیکن جب ہم خود قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں تو ہمارے اندر ایسی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جس سے دل گواہی دیتا ہے کہ واقعی یہ خدا کی کتاب ہے، اسی طرح نبی ہمیں عبادت کی تعلیم دیتا اور طریقہ بتاتا ہے لیکن جب ہم صدق دل سے نماز میں اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں تو ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری روح - روح الٰہی سے متصل ہوگئی ہے، اس وقت نماز ہمارے لئے ذاتی دریافت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

تصوف اپنی اصل صورت میں دین کا نصف ثانی نمائندہ ہے اور فقہ دین کے نصف اول کا نمائندہ، جب دونوں مل کر عمل کرتے ہیں تو اسی کا نام اسلام ہے۔

تاریخ کا المیہ ہے کہ ہر چیز ابتدا میں فطرت کی سطح پر شروع ہوتی ہے مگر بعد میں حد سے گزر جاتی ہے، تصوف کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، اولین دور میں تصوف فطرت کے دائرے میں تھا مگر بعد میں صوفیا حد سے آگے بڑھ گئے اور انہوں نے اسلام کا رنگ تصوف پر غالب کرنے کے بجائے تصوف کو اسلام پر غالب کرنا شروع کر دیا، اس طرح تصوف کی اصل روح ناپید ہوگئی۔

قرآن پاک میں عالم فطرت پر غور کرنے کے لئے ۷۵۶ آیات آئی ہیں، اس کے برعکس صوفیا کا نظریہ ہے کہ شیخ ہی تمام کمالات کا خزانہ ہے، دور اول کے صوفیا قرآن پاک کی فکر سے متاثر تھے، چنانچہ انہوں نے تصوف کے ساتھ علمی میدان میں بھی بڑے کارنامے سرانجام دیے، انہوں نے فطری علوم کی طرف بھی مکمل توجہ دی اور جدید علمی انقلاب کا آغاز کیا لیکن بعد کے صوفیا نے انسانی ذہن پر جمود طاری کر دیا، دور حاضر میں اعلا تعلیم یافتہ طبقے میں اسلام کو مقبول بنانے کے لئے جدید اعلا معیار کی ضرورت ہے جو کہ صوفیا مہیا نہ کر سکے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذہین طبقہ حلقۂ اسلام سے باہر رہ گیا، اگرچہ مسلمانوں کی کمیت میں اضافہ ہوا مگر کیفیت کے اعتبار سے مسلمان وہ مقام حاصل نہ کر سکے جو انہیں حاصل کرنا چاہیے تھا۔

موجودہ زمانہ سائنسی انقلاب کا زمانہ ہے، انسانی فکر میں زبردست تبدیلیاں آ رہی ہیں، میڈیا نے پوری دنیا کو ایک کمرہ میں لا کھڑا کیا ہے، اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلام کو وقت کے تقاضوں کے مطابق علمی معیار اور دور حاضر کے دلائل کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے تا کہ جدید طبقہ اس کی طرف راغب ہو۔

حوالہ جات

(۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ج ۶، ص ۴۱۸۔
(۲) R. A. Nicholson, Thy Mystics of Islam, Lahore, 1982, p3-6
(۳) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ج ۶، ص ۴۱۸-۴۳۷۔
(۴) ایضاً۔
(۵) A. J. Arberry, Muslim Saints and Mystics, London, 1966, p 4.
(۶) Nicholson, p 3-4.
(۷) Dr. Allama Muhammad Iqbal, The Development of Metaphysics in Persia. Lahore,

1964, First published in 1954, p 77-78. (۸) کشف المحجوب، چوتھا باب، خرقہ پوشی۔
(۹) ایضاً۔ (۱۰) علامہ ابوالفضل، آئین اکبری، ج ۲، اردو ترجمہ از مولوی محمد فدا علی، سنگ میل پبلی کیشنز، ش-ن-ص ۳۱۷-۳۴۴۔ (۱۱) آئین اکبری، ص ۳۲۴۔ (۱۲) ایضاً، ص ۳۲۱-۳۲۶۔
(۱۳) مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک، مجلس نشریات اسلام، کراچی ۱۹۸۰ء، ص ۹۳۔ (۱۴) شیخ محمد اکرام، آب کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۸۲ء، ص ۲۵۳۔ (۱۵) ایضاً۔
(۱۶) آب کوثر، ص ۲۵۴۔ (۱۷) رود کوثر، ص ۳۵-۴۱۔ (۱۸) ایضاً، ص ۷۲-۷۳۔ (۱۹) آب کوثر، ص ۲۲۶-۲۲۸۔ (۲۰) محمد دارا شکوہ، مجمع البحرین، منزل نقشبندیہ، لاہور، س-ن، ص ۲-۳۔ (۲۱) ایضاً، ص ۳۔ (۲۲) ایضاً، ص ۲۔ (۲۳) ایضاً، ص ۳-۶۔ (۲۴) ایضاً، ص ۶-۹۔ (۲۵) ایضاً، ص ۹۔
(۲۶) ایضاً، ص ۹-۳۶۔ (۲۷) رود کوثر، ص ۲۸۵-۲۸۸۔ (۲۸) مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک، ص ۹۳۔ (۲۹) جلال الدین رومی، مثنوی معنوی مولانا روم دفتر اول، ص ۶۷۔ (۳۰) ڈاکٹر عبدالخالق-پروفیسر یوسف شیدائی، مسلم فلسفہ، ص ۹۶۔ (۳۱) القرآن ۶۲:۲۔
(۳۲) القرآن ۲:۲۶۹۔ (۳۳) جلال الدین رومی، مثنوی معنوی مولانا روم دفتر اول، ص ۶۷۔
(۳۴) ایضاً، ص ۲۶۔ (۳۵) القرآن ۵۷:۳۔ (۳۶) القرآن ۲:۱۱۵۔ (۳۷) القرآن ۲۴:۳۵۔ (۳۸) القرآن ۸:۱۷۔ (۳۹) بحوالہ کشف المحجوب (مترجم عبدالرؤف فاروقی)، ص ۱۷۷۔
(۴۰) شاہ ولی اللہؒ، حجۃ اللہ البالغہ، ص ۳۴۲۔

غیر ملکی زبانوں کے تدریسی مسائل-
عربی کے حوالے سے

از:- جناب سید احسان الرحمان صاحب☆

کسی بھی غیر ملکی زبان کا سیکھنا نامکمل سمجھا جاتا ہے، اگر اس کا دعوے دار زبان کے ان چاروں پہلوؤں پر پوری طرح قابض نہ ہو جو اس ہنر یا علم کی تکمیل کرتے ہیں، ان چار اجزا کو علما نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے: سنے جانے پر اس زبان کو سمجھنا جس کو انگریزی زبان میں Comprehension کہتے ہیں، دوسرا اس کو ٹھیک سے پڑھنا، تیسرے اس کو لکھنا اور چوتھے نمبر پر اس زبان کو کما حقہ بولنا، اگر ہم اس تجربہ پر غور کریں جس سے ہوکر ہم اپنی مادری زبان کو سیکھتے ہیں تو ہم کو احساس ہوگا کہ یہ چوتھا نمبر ہی دراصل کسی زبان کو سیکھنے کی پہلی سیڑھی ہے، اگر اس سیڑھی پر سب سے پہلے چڑھ لیا جائے تو باقی تین مراحل آسانی سے طے ہو جاتے ہیں لیکن کسی بھی غیر ملکی زبان کے سلسلے میں اکثر ایسا ہوتا نہیں ہے بلکہ بعد والی سیڑھیوں کو پہلے طے کرنا ہوتا ہے اور آخر میں نمبر آتا ہے بولنے کا اور ایسا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اکثر و بیشتر کسی بھی غیر ملکی زبان کو اس کے ماحول سے بہت دور اور غیر اہل زبان سے سیکھنا شروع کیا جاتا ہے، اس کے علاوہ ہم اپنے ملک ہندوستان کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ طالب علم کی فہرست میں غیر ملکی زبان کو سب سے نیچے جگہ ملتی ہے اور یہ بات متوسط صلاحیت والے طلبا کے بارے میں بھی بالکل یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے، ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ یہ بات غیر ملکی زبانوں کے طلبہ اور عربی زبان کے طلبہ پر بہ درجۂ اتم صادق آتی ہے، عام طور پر وہ اپنی مادری زبان میں بھی اتنے کم زور ہوتے ہیں کہ کسی بھی اہم پیغام کو ٹھیک ڈھنگ سے پیش نہیں کر پاتے، یہ بات جتنی آج سے پہلے

☆ جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، نئی دہلی۔

بیچ تھی اتنی ہی سچ ہے۔

اسی لئے لسانیات کے علما اب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کسی بھی غیر ملکی زبان کو سیکھنے کی کوشش کرنے سے پہلے طالب علم کو اپنی مادری زبان یا کسی بھی پہلی زبان کو اچھی طرح سیکھنا ہوگا، اس کے لئے ضروری ہے کہ اوپر بتائے گئے زبان کے چار پہلوؤں کو اپنے قابو میں کرے، جون لوک (John Locke) (۱۶۳۲ـ ۱۷۰۴) اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کسی بھی دوسری زبان کو سیکھنے کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے کسی انسان کا اپنی پہلی زبان یعنی مادری زبان کو ٹھیک سے سیکھنا بہت ضروری ہے (۱)، ایک عرب ماہر لسانیات ابو ہلال عسکری کہتے ہیں کہ کسی بھی دوسری زبان کی طرف توجہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ایک زبان یعنی پہلی زبان کو ٹھیک سے سیکھ لیا جائے، اس طرح دوسری زبان سیکھنے میں آسانی بھی ہوتی ہے اور دوسری زبان کا انداز بیان کھل کر سامنے آتا ہے (۲)، (ابو ہلال الحسن العسکری دور وسطیٰ کے ایک ماہر لسانیات ہیں)، اس کے علاوہ میں یہاں یہ بات زور دے کر کہنا چاہوں گا کہ کسی بھی غیر ملکی زبان کو پڑھنے کا کام نہایت سنجیدہ مزاجی سے کرنا ہوگا، طالب علم میں نئی زبانیں سیکھنے کا مادہ بھی ہونا چاہیے اور اس کام میں اس کی رہنمائی کرنے کے لئے ایک قابل استاد کی ضرورت ہوگی، عمر فروخ کہتے ہیں: زبان کا سیکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے، اس مقصد کے حصول کے لئے صحیح معنوں میں خواہش کا ہونا ضروری ہے (۳) اور ہمارے خیال میں کسی بھی نئی زبان کو سیکھنے کے لئے مقصد کا ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔

ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ کلاس کے ماحول کو ایسا بنایا جائے کہ طالب علم کے دل میں کلاس میں بیٹھنے کا شوق پیدا ہو اور کلاس کا ماحول زبان سیکھنے میں اس کا معاون ہو، صرف اور صرف ان طلبا کا داخلہ غیر ملکی زبانوں میں لیا جائے جن میں نئی زبانیں سیکھنے کی قدرتی صلاحیت موجود ہو اور جن میں نئی زبان سیکھنے کا جذبہ ہو، مصری سیاق میں وہاں کی قومی کونسل برائے تعلیمی اور علمی مباحث نے سفارش کی ہے، ''موجودہ علمی بلندیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارے لئے یہ بات ضروری ہو جاتی ہے کہ یورپی زبانوں کے تحصیلی معیاروں کو بلند کریں تا کہ زیادہ ذہین طلبہ ان کی طرف رخ کریں، ایسے طلبہ جن میں غیر ملکی زبانیں سیکھنے کی صلاحیت بھی ہو اور خواہش بھی''۔ (۴)

اس مصری سفارش کو مدنظر رکھتے ہوئے میں یہاں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ ہم کو اپنے سیاق میں ذہین طلبہ کو غیر ملکی زبانوں کی تحصیل کے لئے راغب کرنے کے لئے مناسب قدم اٹھانے ہوں گے اور اس ضمن میں ہماری نظر میں سب سے اونچا مقام عربی زبان کا ہونا چاہیے، ہم کو کم مدتی ہی سہی کچھ ایسے پروگرام بنانے ہوں گے جن کے تحت طلبہ کو اہل زبان کے بیچ رہنے اور زبان کو استعمال کرنے کا موقع ملے، اسی طرح طالب علم کے سامنے زبان (عربی زبان) سیکھنے کا ایک ٹھوس مقصد ہونا چاہیے، جرجی زیدان اپنی کتاب ''فلسفہ لغات'' میں کہتے ہیں ''کسی بھی قوم کی تہذیب اور اس کے سماجی نظام کو اس کے صحیح پس منظر میں جاننا اور سمجھنا، اس کی زبان جانے بغیر بہت ہی مشکل کام ہے، ہم کسی بھی انسان کو پوری طرح اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک اس کے وسیلۂ بیان کو نہ سمجھ سکتے ہوں''۔ (۵)

ایسا کہنا بالکل حق بہ جانب ہوگا کہ ہر نئی زبان ایک نئی تہذیب اور ثقافت کے دروازے ہم پر کھول دیتی ہے لیکن صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے، ہم کو یہ جان کر ابتدا کرنی ہوگی کہ ہم ایک مترجم بنا رہے ہیں یا پھر ترجمان، ہم کو ایک استاد کی ضرورت ہے یا پھر طرفین کے درمیان ایک وسیط کی، اپنی منزل کو نظر میں رکھ کر ہی ہم کو اپنا معیار اور اپنا راستہ مقرر کرنا ہوگا، تا کہ زبان کی تحصیل کے بعد اس سے صحیح صحیح کام بھی لے سکیں، بہر حال منزل چاہے کوئی بھی ہو لیکن غیر ملکی زبان بولنا اور اس کے ذریعہ اپنے افکار کو بہ خوبی اور بہ سہولت دوسروں تک پہنچانا ایک ضروری جز ہے لیکن ہمارے خیال میں غیر ملکی زبان کے ہر طالب علم کے لئے قطعاً ضروری نہیں ہے کہ زبان کے چاروں مذکورہ پہلوؤں پر حاوی ہو، زبان کو سمجھنا، پڑھنا، لکھنا اور بولنا، جب کہ ایک استاد کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ ان چاروں ہنروں میں یکتا ہو لیکن ایک باحث یا ماہر سائنس یا پھر ٹورسٹ گائیڈ کے لئے ضروری نہیں ہے کہ ہر چار ہنر میں اس کا معیار نہایت بلند ہو، اگر ایک باحث اپنی ضرورت کی عبارتیں پڑھ سکتا ہو، ان کو سمجھ سکتا ہو تو ہماری رائے میں اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے، ہم لوگ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں اور اس بات کے معترف بھی ہیں کہ ضروری نہیں کہ ایک ترجمان (یعنی زبانی ترجمہ کرنے والا) ایک اچھا مترجم (لکھ کر ترجمہ کرنے والا) بھی ہو، یہ دونوں خوبیاں ایک شخص میں پائی بھی جا سکتی ہیں اور نہیں بھی پائی جا سکتیں، اسی طرح یہ بھی

ضروری نہیں ہے کہ ایک ترجمان دوسرے ترجمانوں کی ٹریننگ بھی بہ خوبی کر سکے، کامیاب اساتذہ اچھے ترجمان بھی ہوں، ایسا ہونا لازم وملزوم نہیں ہے، اس بات سے ہم کو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ ہر آدمی ہر ہنر اور ہر فن میں ماہر ہو، ہر شخص کا معیار، اس کا ذوق، اس کی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں، ہر فن مولا قسم کے لوگ اللہ میاں روز روز نہیں پیدا کرتے لیکن ہم ہر دم اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ پڑھائی کے دوران یعنی طالب علمی کے دوران ہر طالب علم کو زبان کے چاروں پہلوؤں میں ہنر مندی حاصل کرنے کے لئے محنت کرانی چاہیے اور کرنی چاہیے، اب یہ بات الگ ہے کہ کون سا طالب علم کون سے ہنر میں کامیابی حاصل کرتا ہے یا پھر ہو سکتا ہے کہ وہ چاروں ہنروں میں یکتا ہو کر نکلے، اب آگے پڑھنے سے پہلے ہم کو یہ طے کر لینا چاہیے کہ ایک مستقل طالب علم میں یعنی زبان کے طالب علم میں کن کن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے۔

جہاں تک ہم اپنے تجربے اور معلومات کی روشنی میں اس ضمن میں خوبیاں طے کر سکتے ہیں، ان میں سب سے پہلی اور سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ نئی زبان سیکھنے کے خواہش مند طالب علم کو اپنی مادری زبان میں مکمل قدرت ہونی چاہیے اور مندرجہ بالا چاروں ہنروں میں اسے یکتا ہونا چاہیے، ضروری ہے کہ وہ اپنی مادری زبان یا کوئی بھی پہلی زبان جو اس نے مادری زبان کے طور پر اس کی جگہ سیکھی اور استعمال کی ہو اس میں اس کا پوری طرح ماہر ہونا بہت ضروری ہے اور جہاں تک ہو سکے ایسے طلبہ کو غیر ملکی زبانوں میں اور خاص طور سے عربی زبان میں داخلہ ملنا چاہیے جو اپنی پہلی زبان میں اچھی طرح بول سکتے ہوں، لکھ سکتے ہوں اور سمجھ سکتے ہوں، ایسے لوگ جو باتیں کرنا جانتے ہوں بلکہ باتیں بنانا جانتے ہوں، بات میں بات نکالنا جانتے ہوں ایسے ہی لوگ اچھے ترجمان بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں مگر جو لوگ اپنی زبان کو ہی ٹھیک سے استعمال نہ کر سکتے ہوں، وہ دوسری زبان کیا سیکھیں گے اور سیکھ کر کریں گے بھی کیا، ہم اس بات کو بہ خوبی سمجھتے ہیں کہ مادری یا پہلی زبان میں ہنر مندی لازمی طور پر دوسری زبان کو سیکھنے اور اس کو استعمال کرنے میں نہ صرف مددگار ہوتی ہے بلکہ اس کے بغیر ایسا ہونا ہی ناممکن ہے، الا یہ کہ وہ اس دوسری زبان کو پہلی زبان کے طور پر استعمال کرے۔ (۶)

علاوہ ازیں دوسری زبان کو سیکھنے کا مقصد اور اس کی ضرورت بالکل واضح ہونی چاہیے،

ذہن میں اگر منزل واضح ہو تو اس تک پہنچنا، اس کو حاصل کرنا آسان ہوتا ہے، یہ بات تو ٹھیک ہے کہ بولنے کی حد تک زبان سیکھنے کی صلاحیت ہر شخص میں مختلف ہوگی اور یہی صلاحیت مدت کا تعین کرے گی، زبان کو مکمل طور پر حاصل کرنے کا دارومدار ہر زبان کی اپنی طبیعت پر منحصر ہو سکتا ہے، کوئی زبان نسبتاً آسان ہو سکتی ہے اور کوئی دوسری زبان نسبتاً کم آسان یا مشکل ہو سکتی ہے، کسی زبان کو ٹھیک طور پر استعمال کرنے کی حد تک سیکھنے کے لئے اس زبان میں بہت پڑھنا ضروری ہے، تاکہ طالب علم الفاظ اور تعبیریں سیکھ سکے اور ساتھ ہی ان کا صحیح استعمال بھی، کسی بھی زبان کو اتنا پڑھنا ضروری ہے کہ اس زبان کے الفاظ اور تعبیریں طالب علم کو ازبر ہو جائیں، اس کے روزمرہ کا حصہ بن جائیں۔ (۷)

اس طرح یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ کسی بھی زبان کو بولنے کی حد تک سیکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ زبان ہمارے روزمرہ کا حصہ بن جائے، بالکل مادری زبان یا پہلی زبان کی طرح اور کسی بھی زبان میں اس بلندی تک پہنچنے کے لئے ہم کو وہی سب مراحل طے کرنے ہوں گے جو اپنی مادری زبان یا پہلی زبان کو حاصل کرنے میں طے کرنے ہوتے ہیں.........
اور وہ مراحل ہیں سننا اور سنتے ہی رہنا، زبان کو عملی طور پر مختلف صورت حال میں استعمال کرنا، اس کو پڑھنا اور لکھنا، قصہ مختصر یہ کہ ہم کو کسی بھی دوسری زبان کو سیکھنے کے لئے ان ہی مشکلوں سے گزرنا ہوگا جن سے گزر کر ہم اپنی مادری زبان یا پہلی زبان کی تحصیل کرتے ہیں، اس ضمن میں یہ بہت ضروری ہے کہ طلبہ کی مٹھ بھیڑ اہل زبان سے ہوتی رہے اور یہی وہ ایک اہم ضرورت ہے جو کم از کم عربی کے سلسلے میں ہندوستان میں پوری نہیں ہو پاتی، اس کام کے لئے ہم کو ایسے جیالے اہل زبان کی ضرورت ہے جو صبر و تحمل کے ساتھ غیر اہل زبان نوسکھیوں سے اپنی چھیتی اور خوب صورت زبان کو بے دردی اور غلط طریقوں سے استعمال کرتے ہوئے سن سکیں اور پھر نہایت خلوص کے ساتھ ان کی اصلاح کر سکیں، ان کی ٹوٹی پھوٹی عبارتوں سے مطلب نکال کر سمجھ سکیں اور ان کی ہمت افزائی بھی کر سکیں، صحیح عبارتوں اور تعبیرات سے ان کی آگاہی کر سکیں، ایسے اہل زبان کا نوسکھیوں کے آس پاس ہونا بہت ضروری ہے جو شرمندہ کئے بغیر ان کی رہنمائی کر سکیں، یہاں اس بات کا جاننا بے حد ضروری ہے کہ کسی بھی زبان کو سیکھنے کے لئے اس زبان کا استعمال کیا

جانا بہت ضروری ہے، تاکہ ہمدرد اہل زبان سیکھنے والوں کی ہمت افزائی بھی کریں اور ان کی اصلاح بھی، ابتدائی مراحل میں کلاس کے دوران استاد اور طلبہ کے درمیان بات چیت کا سلسلہ الفاظ سے شروع ہونا چاہیے، ان چیزوں کے نام سے شروع ہونا چاہیے جو وہاں موجود ہوں، یہاں ہم کو زبان کے سیکھنے کا مقصد بھی اپنے ذہن میں واضح رکھنا ہوگا، تاکہ آہستہ آہستہ ہم ویسے ہی الفاظ اور تعبیریں استعمال کریں جن کی ضرورت آگے چل کر ہم کو پڑسکتی ہے، ایسے ہی تدریسی اسباق تیار کرنے چاہئیں جو طلبہ کی آئندہ عملی زندگی میں معاون اور مفید ثابت ہوں، خیال رہے کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی غیر ملکی زبان سیکھنی چاہیے جس کے لئے مناسب وقت لگانا ضروری ہے اور پرخلوص کوشش بھی۔ (۸)

ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ ایک غیر ملکی زبان ہمارے لئے ہمیشہ ایک غیر ملکی زبان ہی رہے گی، اس زبان کو ہم اتنی آسانی سے نہیں سیکھ سکتے جتنی آسانی سے ہم اپنی مادری زبان یا پہلی زبان سیکھتے ہیں، یہ ایک مشکل کام ہے اور خاص طور سے ان لوگوں کے لئے جو عمر دراز ہونے کے بعد یہ کوشش کرتے ہیں، جیسا کہ کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں دیکھنے میں آتا ہے، اس پر طرہ یہ کہ ہم لوگ غیر ملکی زبانیں ایسے ماحول میں سیکھتے ہیں جو ان زبانوں کے لئے اجنبی ہوتا ہے جیسا کہ ہم عربی کے سلسلہ میں کہہ سکتے ہیں، ہم کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ کم عمر طلبا اور بچوں کے مقابلہ میں بالغین کے لئے غیر ملکی زبان سیکھنا زیادہ مشکل کام ہے اور خاص طور سے اگر یہ کام زبان کے لئے اجنبی ماحول میں کیا جائے جیسا کہ عربی کے لئے ہندوستان میں ہے، ہم اپنے تجربے کی روشنی میں یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ بالغین کے لئے یہ بات زیادہ آسان ہو جاتی ہے اگر ان کی تعلیم اس زبان کی مدد سے کی جائے جو انہیں پہلے سے اچھی طرح آتی ہے، ان سب کوششوں کے باوجود ایک اہل زبان اور ہمارے درمیان فرق ہونا لازمی بات ہے، اس کا انداز ادائیگی، اس کا تلفظ، اس کے لفظوں کا اختیار، یہ سب الگ ہی پہچانے جائیں گے، ہم اس مرتبہ کو شاید اسی وقت پہنچ سکتے ہیں جب کہ ہم نے اپنی آنکھ اسی اجنبی ماحول میں کھولی ہو اور اس زبان کو قریب قریب پہلی زبان کی ہی طرح حاصل کیا ہو اور پیشہ ورانہ استعمال کے لئے ڈھنگ سے بعد میں سیکھا ہو۔

اپنے تجربہ کی روشنی میں ہم یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی زبان، چاہے وہ مادری زبان ہو یا غیر ملکی، اگر پڑھنے لکھنے سے قبل اس کو بولنا سیکھ لیا جائے تو بہت آسانی سے اس کی تحصیل کی جاسکتی ہے، اسی مفروضہ کی بنا پر بلاواسطہ تدریسی نظریہ کی بنیاد رکھی گئی لیکن یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ کسی بھی غیر ملکی زبان کے سلسلے میں بلاواسطہ تدریسی نظریہ کی تطبیق ہندوستان میں نہیں کی جاسکتی، ہندوستان میں عربی زبان غیر ملکی زبان ہے اور غیر ملکی زبان رہے گی، اسے ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں استعمال نہیں کرتے اور نہ اسے ہم اپنی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں، اس لئے مذہبی طور پر استعمال ہونے کے باوجود یہ زبان ہماری نہیں ہے، یہ زبان غیر ملکی ہے اور بلاواسطہ تدریسی نظریہ کے تحت ہم اس کی تحصیل نہیں کر سکتے، اس کی تحصیل کے لئے ہم کو ہر وہ امکانی طریقہ استعمال کرنا ہوگا جس سے ہم کو فائدہ ہو، کچھ مصنوعی ماحول بنا کر بلاواسطہ تدریسی طریقہ استعمال کرنا ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے بالواسطہ طریقوں سے اس کو تقویت دینا ہوگی، عربی زبان کو اس اجنبی ماحول میں ٹھیک طور سے استعمال کرنے کے لئے ہمارے لئے قواعد یا گرامر کا جاننا اشد ضروری ہے، تاکہ غیر ملکی زبان کو کماحقہ استعمال کرسکیں (۹)، اس ضمن میں ٹونی رایٹ (Tony Wright) کہتے ہیں:

> "دوسری زبان سیکھنے کے لئے بہت سے دل چسپ اور پڑھنے کے لئے قابل فہم میٹریل کی ضرورت ہوتی ہے .... تاکہ متعلم شام کے وقت اپنی دل چسپی کے مطابق قریب ایک گھنٹہ ایسے میٹریل کا مطالعہ کرسکے .... اور یہ سلسلہ مہینوں تک چلنا چاہیے"۔ (۱۰)

ٹونی رایٹ کا یہ قول اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ہم لوگ بولنا شروع کرنے سے پہلے اپنی زبان کو سننے کا کام کرتے ہیں، ہر لفظ کو، ہر عبارت کو نہ معلوم کتنی بار سنتے ہیں اور پھر اس کو استعمال کرتے ہیں، الفاظ کو افکار کا جامہ ہی کہنا چاہیے، اس لئے کسی بھی زبان میں افکار کے اظہار کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے پاس الفاظ کا ذخیرہ ہو جس کے لئے ہمیں کافی مطالعہ کی ضرورت ہے، محض مادری زبان کا جان لینا کافی نہیں ہے، گرامر یا قواعد وہ اصول ہیں جن کی حدود میں رہ کر ہم کو اپنی فکر کا اظہار کرنا ہوگا لیکن صرف گرامر یا قواعد کا جاننا ہی ضروری اور کافی نہیں ہے، جہاں

تک کسی غیر ملکی زبان کو بولنے کا سوال ہے تو اس میں حاضر اور متکلم میں مکمل تعاون کا ہونا ضروری ہے، حاضر یعنی جس شخص سے مخاطب ہوا جائے، خواہ وہ استاد ہوں، ساتھی یا پھر کوئی دوسرا، ہمدردی اور توجہ کے ساتھ متکلم یعنی بولنے والے کی بات کو سنے اور متکلم کی غلطیوں پر مذاق و تمسخر کے بغیر اس کی اصلاح کرے، تاکہ متکلم میں غیر ملکی زبان بولنے کی خواہش بڑھے۔

عربی زبان کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے تجربہ کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زبان کو سکھانے کے سلسلے میں ہم لوگ اس فطری طریقہ کو نظر انداز کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر ہم طالب علم کے اوپر بہت سا اور غیر ضروری بوجھ لاد دیتے ہیں، اس کو زبان سکھانے کے لئے ایسے سبق اور نصوص استعمال کرتے ہیں جو نہ صرف اس کی ضرورتوں سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ کافی مشکل بھی ہوتے ہیں، قرآن کی آیتوں اور حدیث کی بھرمار کرتے ہیں یا پھر ایسے سبق پڑھاتے ہیں جو اہل زبان کو زبان سکھانے کے لئے تیار کئے گئے ہوں، ہم اس بات میں بھی جلدی برتتے ہیں کہ طالب علم جلد از جلد بولنا سیکھ جائے، جب کہ اس کے پاس نہ تو مناسب الفاظ ہوتے ہیں اور نہ ہی اس کا ماحول اس کام کے لئے سازگار ہوتا ہے، ایس-ڈی-کراشین (S.D. Krashen) کہتے ہیں: "مناسب اور صحیح یہی ہوگا کہ زبان سیکھنے سکھانے کے معاملہ میں ہم طالب علم کے ساتھ جلدی اور زبردستی نہ کریں، ہم کو چاہیے کہ طالب علم کو فیصلہ کرنے کا موقع دیں کہ وہ کب بولنا شروع کرے گا" (۱۱)، کراشین نے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ زبان کے کسی بھی قسم کے استعمال کے لئے ہمیں طالب علم کے ساتھ جلدی نہیں کرنی چاہیے، اس کو اس بات کی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ کب لکھنا اور بولنا شروع کرے گا۔

اگر ہم اوپر کہی گئی باتوں کا خیال رکھیں گے تو کوئی بھی غیر ملکی زبان اس کے اپنے ماحول میں یا پھر اجنبی ماحول میں بہ خوبی آسانی سے سیکھی جا سکتی ہے، ضرورت ہے تو اس بات کی کہ مکمل صبر اور تحمل کے ساتھ بار بار اس کو پڑھا جائے، سنا جائے اور صحیح وقت اور صحیح جگہ پر اس کا استعمال کیا جائے، قصہ مختصر یہ کہ کسی زبان کے طالب علم کو زبان کے مفید اور کارآمد استعمال کے لئے اپنے پاس الفاظ کا ایک ذخیرہ اکٹھا کرنا ہوگا، دوسرے الفاظ میں "اس سے زیادہ کوئی بھی چیز کارآمد نہیں ہو سکتی کہ آہستہ آہستہ اور تھوڑی تھوڑی مقدار میں ان کو لاطینی سکھائی جائے، سب

سے پہلے کچھ نام سکھائے جائیں، ان کو لاطینی زبان میں ان تمام چیزوں کے نام سکھائے جائیں جن سے روزمرہ طلبا کا واسطہ پڑتا ہے، جن چیزوں کو ہم لوگ روزانہ دیکھتے ہیں، مثلاً جسم کے اعضا کے نام سکھائے جائیں"۔ (۱۲)

استاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے کردار کو بہ خوبی اور موثر انداز میں نبھائے، اس کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے طالب علم کی ہمت افزائی کرے، اس کو ضرورت پڑنے پر سہارا دے، خلوص اور پیار بھرے انداز میں اس کی غلطیوں کی اصلاح کرے، غلطی سرزد ہونے پر نہ وہ اپنے طالب علم کی ضرورت سے زیادہ فہمائش کرے اور نہ اس کو دوسروں کے سامنے ڈانٹے اور نہ ہی اس کی غلطیوں کو نظر انداز کرے، تجربہ کار زبان دانوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ غیر ملکی زبانیں سیکھنے کی کوشش نہ صرف یہ کہ تاخیر کا سبب بن سکتی ہے بلکہ اس کا بھی خطرہ ہے کہ ان میں سے کوئی زبان بھی اس کے ہاتھ نہ لگے، ایسی صورت میں اکثر زبانیں گڈمڈ ہو جاتی ہیں، ہم کہنا کچھ چاہتے ہیں اور آوازیں کچھ اور ہی نکلتی ہیں (۱۳)، اس بات کا میں خود اس لئے قائل ہوں کہ یہ غلطی مجھ سے سرزد ہو چکی ہے، میں اپنا سچا واقعہ بیان کرتا ہوں کہ میں نے عربی زبان میں ایم اے کے ساتھ ساتھ فرانسیسی زبان میں بھی داخلہ لے لیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی زبان میں اپنی امیدوں کے مطابق نمبر حاصل نہیں کر سکا اور دوسرے یہ کہ بولتے وقت اکثر زبان کی ایک ایسی صورت وجود میں آتی تھی جس کو نہ فرانسیسی کہا جا سکتا تھا اور نہ ہی عربی۔

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے، کسی زبان کا بولنا سیکھنے کے لئے ہم کو ایک ایسے استاد یا اہل زبان کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر قدم پر ہماری مدد کر سکے، جو ہم کو باتیں کرنے پر مجبور کر سکے، جو باتوں کو طول دے کر ہمارے سامنے الفاظ کا ایک خزانہ رکھ دے، استاد یا اہل زبان کے لئے ضروری ہے کہ وہ آہستہ روی سے صاف اور سلجھے ہوئے لہجے میں باتیں کریں، جس کا ہر لفظ اور ہر آواز بالکل صاف اور واضح ہو، ایسی صورت میں طالب علم کو الفاظ اور آوازوں کی پہچان کرنے کے لئے ضروری وقت مل جاتا ہے، ہم کو اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ گفتگو کے دوران ایسے الفاظ کا کثرت سے استعمال جو عام فہم ہوں اور جہاں تک ہو سکے گفتگو سوقیانہ الفاظ، تعبیرات اور محاوروں سے پاک ہو۔ (۱۴)

کراشین نے بھی اس معاملے میں استاد یا اہل زبان کے اہم کردار کا اعتراف کیا ہے کہ ایک اچھا استاد یا اہل زبان مناسب الفاظ زبان بولنا سیکھنے کے سلسلے میں کتنا مددگار ثابت ہوسکتا ہے، وہ کہتے ہیں: ''زبان بولنا سیکھنے کے سلسلے میں ایک مفروضہ یہ ہے کہ ہم سے جو کچھ کہا جاتا ہے اس سے یا پھر جو کچھ ہم پڑھتے اور سنتے ہیں، ان سے سیکھتے ہیں، ہم جو کچھ بولتے ہیں اس سے اور جو کچھ ہم کہتے ہیں اس سے نہیں سیکھتے، ہاں یہ بات ضرور ہے کہ جو کچھ ہم بولتے ہیں یا لکھتے ہیں اس کے نتیجے میں جو کچھ ہم کو لوٹایا جاتا ہے وہی ہمارے تعلیمی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ (۱۵)

ایسا استاد یا اہل زبان جو زبان کو اچھی طرح استعمال کرنا جانتا ہے، طالب علم کے لئے نعمت ہوتا ہے، کیوں کہ جو جیسا سنتا ہے وہ ویسا بولتا ہے، لہذا بے حد ضروری ہے کہ استاد یا اہل زبان نہ صرف یہ کہ ڈگری یافتہ ہو بلکہ اس کا مہذب اور مثقف ہونا بھی بہت ضروری ہے، اس کے علاوہ بہترین تدریسی اسباق کی ضرورت ہوتی ہے جن کو بولنا سکھانے کے لئے ہی تیار کیا گیا ہو۔

یہ بات تو ہم سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ نہ تو تمام زبانوں میں تمام آوازیں پائی جاتی ہیں اور نہ سب آوازوں کو سب لوگ ٹھیک طرح سے ادا کر سکتے ہیں، ان مختلف اور اجنبی آوازوں کی صحیح طرح ادائیگی کرنے میں موجودہ سمعی اور بصری آلات اور لنگویج لیبریٹریز ہماری خاطر خواہ مدد کرسکتی ہیں، یہاں ہمیں یہ بات بھی سمجھ کر آگے بڑھنا چاہیے کہ دل چسپ قصے کہانیاں اور لطائف بھی کسی غیر ملکی زبان کو سیکھنے میں بہت مددگار ثابت ہو سکتے ہیں، ان چیزوں کو ریکارڈ کر کے بار بار سنا اور سنایا جاسکتا ہے، ان چیزوں کو اہل زبان کی آواز میں ریکارڈ کرنا بہت مفید ہوگا اور اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ یہ آوازیں زنانی، مردانی اور بچوں کی ہونی چاہئیں تا کہ اس میں فطری پن بھی رہے، اس ضمن میں اساطیری کہانیاں زیادہ مناسب رہیں گی، کیوں کہ کم وبیش سب زبانوں میں ایسی باتوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے، یہ آسان بھی ہوتی ہیں اور دل چسپ بھی اور اکثر سبق آموز بھی، جانی پہچانی باتوں کو غیر ملکی زبان میں سن کر ان کی پہچان کرنے میں آسانی ہوتی ہے اور اب صرف الفاظ اور تعبیریں گرفت میں لینے کی ضرورت باقی رہتی ہے، ایک وقت میں صرف ایک کام یعنی الفاظ اور آوازیں پہچاننا اور ان کو سیاق میں یاد رکھنا، ان کہانیوں کو سنا کر ان کے متعلق چند آسان سوال کر کے ان کا جواب طلب کرنے سے موضوع

اور زبان پر طالب علم کی گرفت مضبوط ہوتی ہے اور ہم کو اس کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے اور ہمارا مقصد بھی حل ہو جاتا ہے، ہمارا یہ مشورہ فیلس اور مارک دیتیفاس (۱۹۶۷) کی رائے سے میل بھی کھاتا ہے جنہوں نے کہا ہے کہ زبان سکھانے کے لئے چھوٹی کہانیاں جن کے پلاٹ پیچیدہ نہ ہوں، استعمال کی جانی چاہئیں (۱۶)، اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ ہم ایسے قصے کہانیاں استعمال نہ کریں جن میں گالیوں اور بیہودہ تعبیرات کی بھرمار ہو، جن میں جنسیاتی اشارے کنایے ہوں، جن میں ظلم اور بے دردی ہو کیوں کہ ایسے قصے کہانیاں طالب علم کی توجہ اصل مقصد سے ہٹا کر دوسری چیزوں کی طرف موڑ دیں گی اور شاید ہی وہ اپنی منزل کو پا سکے۔

ایک اہم بات جس پر میں یہاں زور دینا چاہوں گا کہ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ منہ سے نکلے ہوئے ہر ایک لفظ کا شمار زبان میں ہو، کیوں کہ کبھی منہ سے بے ترتیب الفاظ بھی نکل جاتے ہیں یا پھر جاہل مطلق کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ جن کا نہ تلفظ صحیح ہوتا ہے نہ موقع محل، ان کو آوازوں میں تو شمار کیا جاسکتا ہے لیکن حجت سمجھنا صریحاً غلط ہوگا، جس طرح ہم اپنے افکار کو ترتیب دیتے ہیں اسی طرح ہمیں الفاظ کو بھی ترتیب دینا ہوگا، ان الفاظ کو زبان کے دستور کے مطابق ان کو صحیح جگہ پر رکھنا ہوگا، تا کہ ہم ان کے ذریعہ اپنا پیغام دوسروں تک پہنچا سکیں، ہر مفرد لفظ کے اندر ایک معنی ہوتا ہے لیکن جب تک ہم ان کو صحیح ترتیب میں نہیں رکھیں گے تب تک ان کے ذریعہ اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک نہیں پہنچا سکیں گے، علاوہ ازیں جیسا کہ ہم نے اوپر اشارتاً ذکر کیا ہے کہ دنیا کی تمام زبانیں آوازوں کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں، اس وجہ سے ہم سب لوگ سب آوازوں کو صحیح تلفظ کے ساتھ نہیں نکال سکتے، ایسا کرنے کے لئے ہمیں کوشش کرنے کی ضرورت پڑے گی، ہماری اس کوشش میں لنگویج لیباریٹریز اور دوسرے جدید آلات کافی مددگار ثابت ہو سکتے ہیں، ان مشینوں کا استعمال ہم تلفظ کی اصلاح کے لئے کر سکتے ہیں اور ان ہی کے ذریعہ ہم اہل زبان کے تلفظ سے ان کی پہچان کرا سکتے ہیں (۱۷)، بالغین کی تعلیم اور اصلاح کے لئے تو یہ آلات بہت مفید اور مددگار ثابت ہوتے ہیں لیکن ان سب کے باوجود ایک اچھے استاد کی موجودگی بہر حال ناگزیر ہے، اگر طالب علم کو صحیح رہنمائی نہ ملے تو ٹیپ پر مقید اہل زبان کی آواز اور اچھے سبق بے کار ثابت ہو سکتے ہیں، کیوں کہ سیکھنا اور سکھانا تو انسان ہے اور

مشینوں کی اہمیت ضروری مگر ضمنی ہوتی ہے، صحیح اور کارگر رہنمائی کی غیر موجودگی میں مشینوں سے نکلنے والی آوازیں سمجھ میں نہ آنے والا غل بن کر رہ جائے گا۔ (۱۸)

اوپر یہ عرض کیا گیا تھا کہ کسی بھی زبان کا غیر ماحول میں بولنا، سیکھنا یا سکھانا آسان کام نہیں ہے بلکہ یہ کہنا شاید زیادہ صحیح ہوگا کہ یہ کام بہت مشکل ہے، زیادہ صحیح اور موثر تو یہ ہے کہ کسی بھی زبان کو اس کے اپنے ماحول میں بولنا سیکھا جائے اور اس کام کی ابتدا منفرد الفاظ سے شروع کی جانی چاہیے، جیسا کہ ہم اور ہمارے بچے اپنی مادری زبان کو سیکھتے ہیں، مکمل جملوں میں بات چیت کا نمبر الفاظ اور ٹوٹے پھوٹے جملوں کے بعد ہی آتا ہے، کسی زبان کو سیکھنے کا یہی فطری طریقہ ہے، اسی طرح آہستہ روی سے زبان سیکھی جاتی ہے، وہ طلبہ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں جنہیں زبان حاصل کرنے کا موقع مقتدر اور ہمدرد اساتذہ کی زیر نگرانی ملتا ہے۔

ہم نے عام طور پر لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ زبان وہی صحیح ہے جو اہل زبان بولتے ہیں، ہم اس مقولہ سے اتفاق ضرور کرتے ہیں مگر تھوڑی سی احتیاط کے ساتھ، یہاں یہ بات سمجھ کر آگے بڑھنا ہوگا کہ اہل زبان کو اپنی مرضی کے مطابق زبان استعمال کرنے کا حق نہیں ہوتا، ہر زبان کے کچھ قاعدے اور کچھ اصول ہیں جن کی حد میں رہ کر ہی ہم زبان کو یا کسی بھی زبان کو استعمال کرسکتے ہیں، ایک زبان کے الفاظ کو دوسری زبان کے الفاظ کے ساتھ ملا جلا کر استعمال کرنا، صرف بولنے کی حد تک تو ہماری نظر میں ٹھیک ہے لیکن اس طرح لکھنا ہم مناسب نہیں سمجھتے، ہارولڈ ماڈسین اور جے ڈی باوین کا کہنا ہے کہ اس مقولہ کا مطلب صرف اتنا ہے کہ کسی زبان کو اس کی موجودہ صورت میں استعمال کرنا چاہیے، قدیم اور متروک الفاظ اور تعبیروں کو استعمال کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے، ہر زبان کو اس کے موقع و محل کے مطابق استعمال کرنا چاہیے، قصہ مختصر یہ کہ ایسے اسلوب اور طرز بیان سے پرہیز کرنا چاہیے جن کا رواج اور چلن نہ ہو۔ (۱۹)

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ بول چال کی زبان خواہ کوئی بھی زبان ہو کسی نہ کسی حد تک لکھی جانے والی زبان سے مختلف ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اساتذہ نے ہمیشہ اس بات کی سفارش کی ہے کہ بول چال میں بھی قاعدے قانون کے مطابق ہی زبان کا استعمال کرنا چاہیے، یہ بھی ایک سچائی ہے کہ بولتے وقت قاعدوں کو خیال میں رکھیں گے تو بولنے میں رکاوٹ پڑے گی، لہذا

ایسا سمجھا جاتا ہے کہ کسی بھی زبان میں گفتگو کرنے سے پہلے اس زبان میں ایک خاص حد تک زبان کی تحصیل ضروری ہے، تاکہ بولتے وقت (طالب علم حضرات) سیدھے طور پر اس زبان میں سوچیں ور زبان کے قاعدے اور اصول ان کے لئے رکاوٹ نہ بنیں، اجنبی ماحول میں کسی بھی غیر ملکی زبان کے طلبا کو ہم کلاس کے دوران اسی غیر ملکی زبان میں بات چیت کرنے کے لئے ہمت افزائی کرسکتے ہیں اور سیدھے سیدھے اسی غیر ملکی زبان میں ان کے سبق کو سمجھانے اور معانی سمجھانے کی کوشش کرسکتے ہیں اور سبق کو پڑھنے کی مشق کراسکتے ہیں لیکن ہماری نظر میں اور ہمارے تجربہ کے مطابق ان سب باتوں کو ان کی مادری زبان میں دہرا دینے میں کوئی برائی بھی نہیں ہے اور خاص طور پر زبان کی تعلیم کے ابتدائی مراحل میں (۲۰)، یہ وہ طریقہ ہے جس کو ہم ''تعدیل شدہ بلاواسطہ'' کا نام دے سکتے ہیں (Modified Direct Method)، عربی بولنا سکھانے کے سلسلے میں میں نے اس جدید طریقہ کو کافی معاون پایا ہے، سچی بات تو یہ ہے کہ ہم کو یہ سمجھنا ہوگا کہ پہلی مادری زبان فطری طریقہ سے حاصل کی جاتی ہے جب کہ دوسری زبان (خاص طور پر غیر ملکی زبان اجنبی ماحول میں) سیکھی جاتی ہے ایک خاص مقصد کے لئے، عام طور پر ایسا دیکھا گیا ہے کہ دوسری/ غیر ملکی زبان سیکھنے میں وقت لگتا ہے جب کہ خود طالب علم کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کم وقت میں بہت زیادہ سیکھ سکے، ٹونی رایٹ (Tony Wright) کا کہنا ہے کہ زبان کا حاصل کرنا زبان سیکھنے کے عمل سے دو طریقوں سے مختلف ہوتا ہے:

۱- زبان کا حصول سست رفتار لیکن وقیع ہوتا ہے، کسی زبان کو تیزی سے سیکھا جاسکتا ہے۔

۲- زبان کے حصول میں وقت لگتا ہے، مثال کے طور پر اس کام کے لئے ہفتہ میں پانچ گھنٹوں سے زیادہ چاہیے، صرف صیغۂ شرطیہ سیکھنے کے لئے نو مہینے سے زیادہ لگ سکتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ اس میں سالوں لگ جائیں جب کہ اچھا زبان داں کسی دوسری زبان کو بہت کم وقت میں سیکھ سکتا ہے۔ (۲۱)

بولنے بھر کی زبان کو سیکھنے کے معاملے میں گرامر کو اس سے جوڑ کر نہیں دیکھنا چاہیے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب کوئی انسان کسی زبان کو بولنے کے لائق ہوتا ہے اس وقت تک گرامر اس کے وجود کا ایک حصہ بن چکی ہوتی ہے، بولنا سیکھنے کے لئے ہمیشہ اس بات کی کوشش کرنی چاہیے

کہ زبان کو بولنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں اور ایسے لوگوں کے ساتھ باتیں کی جائیں جو اس زبان میں بولنے کی مہارت حاصل کر چکے ہوں اور وہ اس زبان میں بہ آسانی اور بہ خوبی اپنا مافی الضمیر بیان کرنے پر پوری طرح قادر ہوں، علاوہ ازیں طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اچھے مصنفین کی کتابیں پڑھے۔(۲۲)

یہاں ہم یہ بات واضح کردینا چاہتے ہیں کہ زیادہ تر لوگ غیر ملکی/ دوسری زبان اس کے فطری ماحول یعنی اہل زبان کے بیچ میں رہ کر سیکھنے پر زور دیتے ہیں، اس کا صاف مطلب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فرانسیسی زبان سیکھنے کے لئے ہم کو فرانس میں رہنا ہوگا، فارسی سیکھنے کے لئے ایران میں اور عربی سیکھنے کے لئے کسی عرب ملک میں، شاید اسی مفروضہ کی بنیاد پر وہ زبان کو ’’عادت‘‘ کہتے ہیں لیکن ہماری نظر میں یہ مفروضہ قطعاً ٹھیک نہیں ہے، مثال کے طور پر علامہ السیوطی (۱۴۴۵-۱۵۰۵) نے صاحب البحر المحیط الزرکشی کے حوالے سے کہا ہے کہ افعال اور اسماوہ الفاظ ہیں جن سے کسی بھی زبان میں چیزوں اور ان سے سرزد ہونے والے کاموں کا پتہ چلتا ہے لیکن جملوں پر یہ بات صادق نہیں آتی (۲۳) کیوں کہ مختلف لوگ اپنی زبان میں ایک ہی بات کو مختلف انداز میں کہتے ہیں۔

اپنی بات کو ختم کرنے سے پہلے ہم کو اس مضمون میں عربی زبان میں بولنا سیکھنے کے حوالے سے یہ کہنا بھی بالکل مناسب لگتا ہے کہ فطری طور پر معمولی علاقائی اختلافات کے علاوہ عربی زبان کے دو اہم پہلو ہیں، ایک وہ زبان ۱- جو روزمرہ کے استعمال میں آتی ہے جس کو عامیہ یا دارجہ کہتے ہیں اور دوسرے ۲- معیاری عربی زبان، یہاں یہ بات واضح کردینا ضروری ہے کہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بولنے اور لکھنے والی زبانوں کے درمیان زیادہ فرق نہیں پایا جاتا ہے جب کہ عربی زبان میں یہ فرق اتنا واضح اور اتنا زیادہ ہے کہ ان پر دو الگ زبانیں ہونے کا دھوکا ہوتا ہے، نہ صرف ہر عرب ملک میں بلکہ ان عرب ممالک کے شہروں، دیہاتوں اور قصبوں میں روزمرہ بولی جانے والی عربی کی کچھ اپنی خصوصیات ہیں، کچھ اپنے لہجے ہیں جو ایک علاقے کے رہنے والے شخص کو دوسرے علاقے کے رہنے والے شخص کے لئے اجنبی سا بنا دیتے ہیں اور یہ لوگ آپس میں اسی وقت ایک دوسرے کی بات کو سمجھ سکتے ہیں جب کہ معیاری عربی زبان کا استعمال

کیا جائے، عامیہ لہجوں میں اس حد تک اختلاف کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں، اسلام آنے سے قبل اس عرب علاقہ میں رہنے والے قبائل اپنی حدود میں مست رہتے تھے، آپس میں قبائل کا ملنا جلنا بھی محدود ہی رہا ہوگا، ان میں سے بہت سے قبائل کی زبانیں عربی سے ملتی جلتی ہوں گی یعنی عربی زبان کے وسیع دائرہ میں رہ کر بھی ان میں الفاظ اور تعبیری اختلاف رہے ہوں گے (جو بعد میں عربی زبان کی وسعت کا سبب بنے ہوں گے)، اسلام آنے کے بعد اور اس کو اپنا دین قبول کرنے کے بعد ہی ان قوموں یا قبائل میں ’’اتحاد‘‘ کا تصور پیدا ہوا ہوگا کہ وہ ایک ہیں، ان کی زبان ایک ہے، پھر کچھ ایسے ممالک بھی ہیں جو اسلام سے قبل دوسری زبانیں بولتے تھے لیکن اسلام کے بعد اور اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے عربی زبان ہی قبول کر لی مگر بولنے چالنے والی زبان تو آہستہ آہستہ ہی بدلی ہوگی اور اس میں غیر عربی الفاظ بھی ضرور شامل رہے ہوں گے اور بولنے کے انداز اور لہجے نے تو ضرور عربی بولنے کے انداز پر اثر ڈالا ہوگا۔

ایک دوسری بات یہ ہے کہ زبان سیکھنے کے معاملہ میں لوگوں کے دل میں بہت سی غلط فہمیاں ہیں، جب بھی وہ کسی زبان کے بارے میں سوچتے ہیں یا اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو سب سے پہلے وہ لوگ منفرد الفاظ کے بارے میں ہی سوچتے ہیں اور اکثر یہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اگر وہ ان الفاظ کو رٹ لیں، یاد کر لیں تو وہ اس غیر ملکی زبان میں گفتگو بھی کر سکتے ہیں لیکن زبان داں یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ الفاظ کسی بھی زبان کا صرف ایک عنصر ہے، اس کے علاوہ ان کا تلفظ، صوتی نظام، تعبیریں گڑھنا اور جملے بنانا وغیرہ اور بھی چند عناصر ہیں، جہاں تک ہم سمجھتے ہیں سب زبانوں میں اور عربی کے سلسلہ میں تو ہم دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی آواز کا غلط تلفظ بساط کو مکمل الٹ سکتا ہے اور غلط فہمی کا ایک پہاڑ کھڑا کر سکتا ہے۔

تیسری بات چند مغربی زبانوں کے برخلاف جن کو مقابلتاً آسان کہا جا سکتا ہے، خاص طور سے ان ہندوستانیوں کے لئے جو انگریزی زبان خوب اچھی طرح جانتے ہیں، عربی زبان خاصی مشکل زبان ہے، اپنی اس بات کو ثابت کرنے کے لئے میں فرانسیسی زبان کے ساتھ اپنے تجربہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں، فرانسیسی زبان سیکھنے میں مجھے قطعاً دشواری پیش نہیں آئی، صرف دو

سال میں جز وقتی مطالعہ کے تحت میں اس قابل ہوگیا تھا کہ یہ زبان بول سکوں، لکھ سکوں، پڑھ سکوں اور سمجھ سکوں، جب کہ عربی زبان آج بھی روز ایک نئی آفت لئے سامنے کھڑی رہتی ہے، میرا خیال ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں بلکہ یہی بات ہسپانوی اور دوسری مغربی زبانوں کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے، یہاں تک کہ ان جملوں میں اتنی یکسانیت اور قربت ہوتی ہے کہ ایک ذہین انگریزی داں یہ زبانیں بہ آسانی اور کم وقت میں سیکھ سکتا ہے، مثال کے طور پر انگریزی زبان کا یہ جملہ دیکھئے:

Full explanations and cautions are given in owner's booklet.

اب اس کی فرانسیسی دیکھئے:

Toute explications et precautions dutilization sou don ees dans le mode d'emploi

اب اسی جملہ کو ہسپانوی زبان میں ملاحظہ کریں:

Las explicaciones y precauciones detalladas en el manuel de instruciones

آپ نے دیکھا کہ یہ الفاظ، آوازیں اور بندشیں کتنی ایک دوسرے کے قریب ہیں جبکہ یہی بات جب ہم عربی میں کہیں گے تو آوازیں، ان کی شکلیں اور بندشیں کتنی مختلف ہوں گی، عربی زبان انگریزی-فرانسیسی-ہسپانوی وغیرہ سے کتنی مختلف ہے، لہذا یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ عربی زبان کو اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے نہیں سیکھا جاسکتا ہے جتنا کہ فرانسیسی یا ہسپانوی کو سیکھا جاسکتا ہے بلکہ ہم یہ بات اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ عربی زبان ذرا ہٹ کر ہے، ذرا مشکل ہے۔

اوپر کہی گئی باتوں کی روشنی میں ہم کو نئی زبانیں سیکھنے اور سکھانے کے بارے میں بالکل نئے سرے سے اور سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا ہوگا، ہم کو اپنی منزل کی نشان دہی کرنی ہوگی، ہم کو یہ طے کرنا ہوگا کہ ہم کو کتنے ترجمان، کتنے مترجم اور کتنے اساتذہ درکار ہیں، جہاں تک زبانوں کی تعلیم کا سوال ہے ہم کو اپنی یونی ورسٹیوں میں زبانوں کی تعلیم کو مضبوط کرنا ہوگا اور طلبا کے درآمد اور برآمد کا حساب رکھنا ہوگا، ہم کو کتنے ماہر کس میدان میں چاہیے، اس بات کو دھیان میں رکھ کر

ہی طلبا کو تیار کرنا چاہیے، عمر فروخ کے کہنے کے مطابق ہمارے لئے ضروری نہیں ہے کہ غیر ملکی زبانوں میں تعلیمی سہولتیں اتنی ہی وسیع کردی جائیں جتنی دوسرے علوم اور سائنسی فروغ میں کی جائیں، ان کا کہنا ہے: ایک قوم (یہاں ان کی مراد عرب قوم سے ہے) کے پانچ شاعر، دس افسانہ نویس، تین مورخ اور ایک فلسفی کافی ہیں، البتہ قوم کو ہزاروں ریاضت دانوں کی ضرورت ہوتی ہے، فزکس اور کیمسٹری کے ماہرین کی ضرورت ہوتی ہے، ڈاکٹروں اور انجینئروں کی ضرورت ہے۔(۲۴)

عمر فروخ کے اس قول کو اپنے ذہن میں رکھتے ہوئے میں یہاں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ہم اپنی قوم کی تعداد ذہن میں رکھیں تو ہر غیر ملکی زبان میں ہم کو سو یا اس کے آس پاس ماہرین کی ضرورت پڑسکتی ہے جن کا اہم رول یہ ہوگا کہ وہ ہمارے اور دوسروں کے درمیان جو زبانی خلیج پیدا ہوتی ہے اس کو پاٹ سکیں تاکہ علمی میدان میں دوسروں سے پیچھے نہ رہ جائیں، لہذا اس وقت اس بات کی ضرورت ہے کہ اچھے طلبا کو اچھے اساتذہ کی نگرانی میں دیا جائے، تاکہ وہ لوگ ہماری اہم قومی ضرورت کو پورا کرسکیں اور وطن کی ترقی میں شریک ہوسکیں اور ایسے لوگ "پڑھے فارسی بیچیں تیل" کے مصداق بے ضرورت ایسے میدانوں میں اپنی تقدیر نہ آزمائیں جہاں نہ تو وہ اپنی سیکھی ہوئی زبان کا استعمال کرسکیں اور نہ ہی ان کے سپرد کیا ہوا کام بہ خوبی کرسکیں۔

اس مضمون کے لکھنے میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے:

(۱) Approaches to teaching foreign languages: Ed. M.G. Hesse, North Holand Publishing Company. 1975 p.185/119 ۔ (۲) تاریخ الادب العربی: احمد حسن الزیات (عربی)، بیروت ۱۹۷۸، ص ۱۱۵۔ (۳) الفکر العربی: عمر فروخ (عربی)، بیروت ۱۹۶۶، ص ۱۳۱۔ (۴) المصور، مصر: العدد ۳۲۴، دسمبر ۱۹۸۶ (عربی)۔ (۵) الفلسفۃ اللغویۃ: جرجی زیدان، الدکتور مراد کامل (عربی)، دار الہلال، القاہرہ ۱۹۶۹، ص ۱۲۔ (۶) A Psycholinguistic Model of Grammar Learning and Foreign Language Teaching by Renzo Titone in Active Methods and Modern Aids in the Teaching of

The (۷)۔Foreign Languages: Ed. R. Fillipovic, OUP 1973 p.9
Foreign Language Learner - A Guide for Teachers: Mary Finocohiario
and Michael Banomo, Regent Publishing Company, Inc, New York
Johann Amos Comeniun (1592-1670) vice M.G. (۸) ۔ 1973, p.41
(۹) مرشد المعلم: الدکتور محمد اسماعیل صینی، نصیف مصطفی عبدالعزیز ومختار ۔Hesse pp. 115-118
الطاہر حسین، Arab Bureau of Education for the Gulf State, 1983 ص ۵۵۔
۔Role of Teachers and Learners: Tony Wright OUP 1978 p. 183(۱۰)
Principles and Practice in Second Language Acquisition: S.D. (۱۱)
Sir Thomas Elyot (۱۲) ۔ Krashen, Pergamon-Alemany, 1983 p.74
۔M.G. Hasse, p.115-118 (۱۳) ۔(1490-1546) vice M.G. Hasse, p.67
Adaptation (۱۶) ۔S.D. Krashen, p.57 (۱۵) ۔ S.D. Krashen, p.64(۱۴)
in Language Teaching, Harold a Mednen and J. Donald Bowen,
Aids and Activities in Foreign Language (۱۷) ۔USA 1969, p.5
۔Learning by W.R. Lee in Active Methods..... Ed. R. Filopovic, p.65
(۲۰) مرشد المعلم، ۔Harold and Donal, p (۱۹) ۔S.D. Krashen, p.65 (۱۸)
ص ۵۵۔ (۲۱) Desiderius Erasmus (۲۲) ۔Tony Wright, p. 187
(۲۳) المزہر: علامہ جلال ۔ Rotterdam (1466-1546) vice M.G.Hesse, p.5
الدین السیوطی (عربی) الجزء الاول، بیروت ۱۹۸۷ء ص ۴۳۔ (۲۴) عمر فروخ، ص ۳۔

☆☆☆☆

علامہ شبلیؒ بحیثیت مدیر

از:- ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی☆

علامہ شبلیؒ (۱۸۵۷ - ۱۹۱۴ء) نے مدیر کی حیثیت سے جو کارنامے انجام دیئے اگرچہ گردش ایام نے ان کے نقوش دھندلے کر دیئے ہیں، تاہم اس کا مطالعہ آج بھی دلچسپی اور فائدے سے خالی نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ صدی میں مسلمانوں میں تحقیق و تدقیق، تلاش و تفحص اور مختلف علوم وفنون سے جو شیفتگی پیدا ہوئی اس میں بالواسطہ فیضان شبلی کا بڑا دخل ہے۔

اہل علم و دانش اور ارباب نظر جانتے ہیں کہ شبلی کے ذوق تحقیق وتصنیف کو علی گڑھ نے پر پرواز عطا کی، سرسید اور آرنلڈ کی صحبت، کتب بینی کی سہولت اور علی گڑھ کی علمی فضا نے شبلی کے جذبہ تلاش وتفحص اور تصنیف وتالیف کو جلا بخشی، خود سرسیدؒ نے اپنا ذاتی کتب خانہ جو علم وتحقیق کا خزانہ تھا، شبلی کے لئے عام کر دیا تھا، علامہ شبلی ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''سید صاحب نے اپنے کتب خانہ کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے، سید صاحب کے پاس تاریخ وجغرافیہ عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں جن کو حقیقت میں میں کیا بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے مگر یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں، مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں''۔ (۱)

علی گڑھ میں علامہ شبلی کے تحقیقی کارناموں مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم (۱۸۸۷ء)، المامون (۱۸۸۷ء)، الجزیہ (۱۸۸۹ء)، کتب خانہ اسکندریہ (۱۸۹۲ء) اور سیرۃ النعمان (۱۸۹۱ء) وغیرہ جیسی لازوال تحریروں اور محققانہ کاوشوں نے علامہ شبلی کی عظمت علم وتحقیق کو قبول عام کا درجہ عطا

☆ادب کدہ، مہراج پور، انور گنج، اعظم گڑھ۔

کردیا تھا، چنانچہ ۱۸۹۴ء میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ کے ضمیمہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین کو سرسید نے خالص علم وتحقیق سے عبارت کرنا چاہا تو ان کی نگاہ انتخاب شبلی پر پڑی اور انہیں اس کا اڈیٹر مقرر کیا گیا، خود مولانا شبلی لکھتے ہیں:

"قریباً چار برس ہوئے کہ اس نام کا ایک رسالہ انگریزی اور اردو ملا ہوا علی گڑھ کالج سے نکلنا شروع ہوا، اول اول وہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کا ضمیمہ بن کر نکلتا رہا لیکن ۱۸۹۴ء میں اس نے ایک مستقل رسالہ کی صورت اختیار کی، اس کے مضامین زیادہ تر کالج کی خبروں اور اس کے متعلقات پر محدود ہوتے تھے اور اس وجہ سے عام پبلک کو اس کے ساتھ چنداں دل چسپی نہ تھی۔

اس خیال سے اس کے منتظموں نے اس کو زیادہ وسعت دینی چاہی تاکہ وہ بالکل ایک علمی میگزین بن جائے جس میں کالج کی خبروں کے علاوہ مسلمانوں کے علوم وفنون، تاریخ اور لٹریچر کے متعلق مفید اور پرزور مضامین لکھے جائیں، اس صیغہ کا اہتمام خاص میری سپردگی میں دیا گیا، میں اس رسالہ کے ترقی دینے میں حتی الامکان کوشش کروں گا"۔(۲)

اس کالج میگزین کو علمی آب وتاب دینے کے لئے علامہ شبلی نے سب سے پہلے اردو کے نامور اہل قلم، مصنفین اور انشاپردازوں سے اس میں مضامین لکھنے کی فرمائش کی، چنانچہ مولانا حالی (ف ۱۹۱۴ء)، نواب محسن الملک (ف ۱۹۰۷ء)، ڈپٹی نذیر احمد (ف ۱۹۱۲ء) اور منشی ذکاء اللہ وغیرہ نے مضامین لکھنے کا وعدہ کیا (۳) اور ان کے بعض مضامین شائع بھی ہوئے۔

اس سلسلہ میں علامہ شبلی نے یہ منصوبہ بھی بنایا کہ اس میں اسلامی سلطنتوں کے تمدنی اور انتظامی کارناموں پر علمی وتحقیقی مضامین قلم بند کئے جائیں اور پھر انہیں کتابی صورت میں شائع کیا جائے (۴)، چنانچہ خود انہوں نے متعدد معرکہ آرا تحقیقی مضامین سپرد قلم کئے، علما کے فرائض (جون ۱۸۹۵ء)، اسلامی حکومتیں اور شفاخانے (جولائی ۱۸۹۵ء)، حقوق الذمیین (اپریل، مئی ۱۸۹۶ء)، املا اور صحت الفاظ (مارچ ۱۸۹۸ء)، سرسید اور اردو لٹریچر (جون ۱۸۹۸ء) جیسے ان کے گراں مایہ مقالات اسی زمانہ کی زینت بنے۔

اپنی تحریروں کے علاوہ سرسید، مولانا حالی، منشی ذکاء اللہ، بہادر علی، شیخ عبداللہ، حاجی محمد اسماعیل، حامد علی صدیقی اور پروفیسر ضیاء الدین کے علمی ادبی، تاریخی اور تعلیمی مضامین کے ذریعہ شبلی نے اس میں علمی شان پیدا کرنے کی کوشش کی جو اس دور میں یقیناً ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

کالج میگزین کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے موضوعات متنوع تھے، ادب، تاریخ، تہذیب، تعلیم، سوانح کے علاوہ کالج کی سرگرمیوں اور اس کی تنظیموں کی روداد وغیرہ بھی اس میں شائع ہوئیں، بعض انگریزی مضامین کے ترجمے بھی شائع ہوئے، پروفیسر آرنلڈ کے مضمون "جاپان" کا ترجمہ اسی میگزین میں شائع ہوا۔(۵)

قدیم اسلامی کتابوں کی اشاعت کی تجویز بھی علامہ شبلی نے اسی میگزین میں پیش کی تھی (۶)، ان کا خیال تھا کہ یورپ میں قدیم اور نادر کتابوں کی تلاش وجستجو اور طبع واشاعت کے لئے متعدد انجمنیں قائم ہیں جو بیش بہا خدمات انجام دے رہی ہیں حتی کہ خود مسلمانوں کی نادر الوجود کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر شائع کر رہی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ یہ کام ہم خود انجام دیں اور دنیا کو بتائیں کہ مسلمانوں نے علوم وفنون کا کس قدر گراں مایہ ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔(۷)

ندوۃ العلما کے تیسرے سالانہ اجلاس کی روداد بھی علامہ شبلی کے قلم سے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین (مئی ۱۸۹۶ء) میں شائع ہوئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں ان کی دل چسپی تحریک ندوہ سے ہوگئی تھی، سرسید کی وفات (۱۸۹۸ء) کے بعد اگرچہ انہوں نے حیدرآباد کا رخ کیا مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا دل ودماغ اب تحریک ندوہ سے وابستہ ہوچکا تھا، ایک خط میں انہوں نے لکھا ہے کہ "سچ یہ ہے کہ صرف ندوہ کے لئے میں نے کالج چھوڑا تھا گو واقعات اتفاقی کی وجہ سے اس کا موقع نصیب نہیں ہوا۔(۸)

تحریک ندوہ میں خود ان کے بقول ان کی دل چسپی کی دو خاص چیزیں "نصاب تعلیم" اور ماہنامہ "الندوہ" تھیں (۹)، چنانچہ جب وہ پوری طرح یکسو ہوکر ندوہ آئے تو ان دونوں امور کی طرف مکمل توجہ کی، انہیں الندوہ کا اڈیٹر بنانے میں ارکان ندوہ نے لیت ولعل سے کام لیا (۱۰)، تاہم وہ اڈیٹر بنائے گئے گو مشترک ہی سہی (۱۱) لیکن وقت نے ثابت کردیا کہ اگر وہ اڈیٹر نہ ہوتے تو الندوہ۔ الندوہ نہ ہوتا۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین کی ادارت (۱۸۹۴ء) کے دس سال بعد شبلی نے الندوہ کی ادارت (۱۹۰۴ء) سنبھالی، ظاہر ہے اس کے تجربات یہاں کام آئے ہوں گے، دونوں رسالوں کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ علامہ شبلی علی گڑھ کے بالمقابل یہاں زیادہ آزادی کے ساتھ اپنے افکار و خیالات کو پیش کرتے ہیں، غالباً اس کی بڑی وجہ تحریک ندوہ سے ان کی ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی ہے۔

ماہنامہ الندوہ کی اشاعت کے حسب ذیل مقاصد تھے:

۱-علوم وفنون پر ریویو۔　　۲-علوم قدیمہ وجدیدہ کا موازنہ۔
۳-اثبات عقائد اسلامیہ از عقل۔　　۴-تحقیقات جدیدہ۔
۵-کتب نادرہ قدیمہ پر ریویو۔　　۶-رپورٹ ماہوار ندوہ۔ (۱۲)

ماہنامہ الندوہ کے دستورالعمل میں بھی یہ مقاصد بیان کئے گئے ہیں (۱۳)، البتہ اس میں حسب ذیل اضافہ ہے:

۱-اکابر سلف کی سوانح عمریاں جس میں زیادہ تر ان کے اجتہادات سے بحث ہوگی۔
۲-نصاب تعلیم مروجہ پر بحث۔　　۳-علمی خبریں۔ (۱۴)

الندوہ ان مقاصد کے ساتھ اگست ۱۹۰۴ء میں بڑی آب وتاب سے نکلا اور بہت جلد علمی دنیا میں ایک امتیازی درجہ حاصل کرلیا، شاید ہی کسی اور علمی رسالے کو اس قدر جلد ایسی مقبولیت ملی ہو، وہ ہر حلقے موافق ومخالف میں پڑھا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، ڈپٹی نذیر احمد کے ان عربی اشعار سے اس کی شہرت ومقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

یقولون ان العلم و الفضل و النهی　　حبیس علی المتقدم المتبصر
فلما تصفحنا صحائف ندوة　　وجدنا بان الفضل للمتاخر

ترجمہ: "لوگ کہتے ہیں کہ فضل وکمال اگلوں کا حصہ تھا مگر جب میں نے الندوہ کے صفحے دیکھے تو پایا کہ فضل وکمال پچھلوں ہی کا حصہ ہے"۔ (۱۵)

الندوہ کے ثمرات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

"الندوہ کا اثر خصوصیات کے ساتھ نوجوان علما اور قریب فارغ التحصیل

طلبہ پر بے حد پڑا اور نام نہیں لوں گا مگر بتا سکتا ہوں کہ بڑے بڑے مقدس آستانوں اور درس گاہوں کے حاشیہ نشینوں نے اس کے طرز نگارش اور پیرایہ بیان کی نقل اتاری اور اپنے اپنے دائرے میں ناموری حاصل کی اور ان سے دین وملت کو فائدہ پہنچا"۔ (۱۶)

علامہ شبلی نے ماہنامہ الندوہ کے ذریعہ متعدد کام انجام دیئے، تحریک ندوہ کو بام عروج تک پہنچایا، نصاب تعلیم پر بحث کا آغاز ہوا، علوم قدیمہ پر نقد وجرح کا سلسلہ شروع کیا، ان کے علاوہ شبلی نے اپنے افکار ونظریات کی پیش کش بھی ماہنامہ الندوہ کے ذریعہ کی، اس سلسلے کا سب سے اہم کارنامہ تصنیف وتالیف کے لئے طلبائے ندوہ اور دیگر اہل قلم کی ذہنی ودماغی تربیت ہے، چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ضیاء الحسن ندوی، خواجہ عبدالواحد اور عبداللہ عمادی وغیرہ نے اسی رسالے سے ناموری حاصل کی اور نامور مصنف ہوئے۔

تصنیف وتالیف کے لئے علامہ شبلی نے یہیں مولانا سید سلیمان ندوی کی تربیت کی اور اس کے تمام گر سکھائے، الندوہ کا سب ایڈیٹر مقرر کیا، شذرات لکھنے کا انہوں نے یہیں آغاز کیا، ماہنامہ "معارف" اعظم گڈھ کی ادارت اور اس کی خدمات کا اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت پوشیدہ نہ رہ سکے گی کہ یہ سب شبلی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد الندوہ ہی میں (اکتوبر ۱۹۰۵ء-مارچ ۱۹۰۶ء) شبلی کی زیر تربیت رہے، یہیں سے علمی دنیا میں وہ متعارف ہوئے، ارباب نظر جانتے ہیں کہ "الہلال" میں جو کچھ جلوہ گر ہوا، اصلاً اس کا تخم الندوہ ہی میں پڑا تھا، مولانا آزاد کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی بھی الہلال سے وابستہ رہے جن کی تربیت بھی شبلی نے الندوہ ہی میں کی تھی۔

صاحب اقبال کامل اور مصنف شعرالہند مولانا عبدالسلام ندوی نے الندوہ ہی سے قلم پکڑنا سیکھا، ۱۹۰۶ء میں ان کا پہلا مضمون "تناسخ" شائع ہوا، علامہ شبلی نے ان کی بڑی حوصلہ افزائی کی اور ان کے بڑے مصنف ہونے کی پیشین گوئی کی۔ (۱۷)

تصنیف وتالیف کی تربیت اور ذہنی ودماغی نشو ونما کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی کے بعد ہندوستان میں علم وفن کی جو بہار آئی اور اہل قلم اور ناموران علم و فن کی جو کہکشاں سجی وہ سب فیضان شبلی ہی کا پرتو ہے ؎

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو   ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

علامہ شبلی نے الندوہ کی ادارت کے زمانے میں احباب ومعاصرین اور خاص طور سے اپنے تلامذہ کو جو خطوط لکھے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مدیر کی حیثیت سے ایک ایک پہلو پر نظر رکھتے تھے، موضوعات، مقاصد اور معیار کا انہیں بڑا خیال رہتا، ایک مرتبہ اپنی بعض مصروفیات کی وجہ سے الندوہ کے لئے مضامین نہ لکھ سکے تو سب ایڈیٹر مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھا کہ ''عزیزی چند روز تک میرے مضمون سے اب پرچہ بالکل خالی رہے گا، دیکھو ایسا نہ ہو کہ اپنی حیثیت سے گر جائے''۔(۱۸)

مضامین کی ترتیب، کتابت وطباعت کا حسن، تصحیح وغیرہ کا وہ بڑا خیال رکھتے (۱۹) اور حسن ونفاست کے ساتھ اس کی اشاعت کے خواہش مند رہتے (۲۰)، وہ ایک ایڈیٹر کے لئے ضروری خیال کرتے تھے کہ مضامین بغیر دیکھے شائع نہ ہوں (۲۱) اور ایک دو ماہ کے مضامین ہمیشہ موجود رہیں۔(۲۲)

ادب وانشا اور تحریر کے معیار و مذاق کا بھی انہیں بڑا خیال رہتا، مولانا عبدالسلام ندوی نے رسالہ ''ادیب'' الہ آباد پر تبصرہ کیا اور لکھا کہ ''حال میں الہ آباد انڈین پریس سے ادیب ظاہری شکل وصورت میں اس آب ورنگ سے نکلا کہ تمام لوگ پکار اٹھے کہ ؎

اس طرح کا جمال ہو، ایسا شباب ہو (۲۳)

چوں کہ یہ تبصرہ شذرات میں لکھا گیا تھا اس لئے علامہ شبلی نے تنبیہ کی اور مولانا عبدالسلام ندوی کو لکھا کہ:

''رسالہ ادیب کی نسبت تم نے جو ریمارک لکھا ہے وہ ایڈیٹوریل میں لکھا ہے، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ میرا لکھا ہوا ہے، مجھ کو اس سے نہایت افسوس ہوا، میرا وہ طرز عبارت نہیں اور جو مصرعہ تم نے نقل کیا ہے اس کو میں اپنے حق میں

ازالہ حیثیت عرفی سمجھتا ہوں، آئندہ احتیاط رکھو کہ ایسے مبتذل اور عامیانہ فقرے درج نہ ہونے پائیں''۔(۲۴)

اس تنبیہ کے بعد مولانا عبدالسلام ندوی نے اس کی تردید کی (۲۵)، مگر بالآخر علامہ شبلی کا خدشہ درست نکلا، مولانا عبدالحلیم شرر نے ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' کے عنوان سے ان پر سخت تنقید کی۔(۲۶)

اسی طرح مولانا سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھا کہ ''دونوں پرچوں میں تمہارا مضمون بہت اچھا نکلا، اب تم کو تصنیفی سلیقہ آچلا ہے البتہ عبارت کی ابھی تک کم زوری باقی ہے''۔(۲۷)

علمی رسالوں کے لئے علامہ شبلی علمی خبروں کو ضروری خیال کرتے تھے، ان کی کوشش ہوتی تھی کہ الندوہ میں پابندی سے علمی خبریں شائع کی جائیں، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالسلام ندوی اپنی سب ایڈیٹری کے زمانہ میں اس کا اہتمام کرتے رہے، سید صاحب نے بھی اس کالم کو جاری رکھا، ایک مرتبہ کئی ماہ تک ناغہ ہوگیا تو علامہ شبلی نے تنبیہ کی اور لکھا کہ ''تم نے غلطی کی اور ہمیشہ یہ غلطی ہوتی ہے کہ الندوہ میں علمی خبریں نہیں دیتے جس کی وجہ سے اب کی ۲۰-۲۵ روپئے کا نقصان اٹھانا پڑا''۔(۲۸)

علامہ شبلی نے کسی تنقید کا جواب سوائے المامون (۲۹) کے نہیں لکھا، ان کے ایک مضمون ''اسلام اور مسئلہ ارتقا'' پر اعتراضات ہوئے (۳۰)، سید صاحب نے اس کا جواب لکھا (۳۱)، علامہ نے اس پر ناراضگی ظاہر کی اور لکھا کہ ''اس سے کم ظرفوں کا حوصلہ بڑھتا ہے کہ ہم بھی اتنے ہیں کہ لوگ ہمارا جواب لکھیں (۳۲) مگر پھر انہوں نے اس کی وضاحت کی کہ:

''گزشتہ پرچے میں جو مضمون مسئلہ ارتقا پر نکلا تھا اس کا مقصد یہ نہ تھا کہ ہمارا یہ عقیدہ بھی ہے بلکہ صرف یہ دکھلانا تھا کہ مسئلہ ارتقا کا خیال ڈارون کا پیدا کیا ہوا کوئی نیا خیال نہیں ہے بلکہ اس سے مدتوں پہلے بعض حکمائے اسلام کی بھی یہی تحقیق تھی''۔(۳۳)

وہ مدیروں کے لئے اہل علم سے ربط وضبط اور خط وکتابت کو بھی لازمی قرار دیتے تھے، مولانا سید سلیمان ندوی کو متعدد خطوط میں اس کی طرف متوجہ کیا ہے۔(۳۴)

خلاصہ یہ کہ علامہ شبلی نے ایک مدیر کی حیثیت سے الندوہ کے ہر پہلو پر نظر رکھی بلکہ اسے خوب سے خوب تر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی اور یہی وجہ ہے کہ ان کے بعد الندوہ کا معیار قائم نہ رہ سکا اور بالآخر وہ بند ہوگیا۔

الندوہ نے دیرپا اثرات قائم کیے اس کے بعد علمی افق پر جو بھی رسائل آئے انہوں نے کسی نہ کسی نوع سے اس کی تقلید کی۔

الندوہ کے جو نتائج نکلے مولانا سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں وہ یہ ہیں:

۱- اردو زبان میں علمی مباحث کا ایک بڑا ذخیرہ پیدا کیا۔

۲- جدید تعلیم یافتوں کو اسلام کے مذہبی اور علمی کارناموں سے آشنا کیا۔

۳- علما کو جدید مسائل سے روشناس کیا۔

۴- عربی خواں طلبہ میں اپنے پرانے ذخیروں سے کام لینے کا سلیقہ پیدا کیا۔

۵- اسلام اور تاریخ اسلام پر بہت سے اعتراضات کو رفع کیا۔

۶- قوم میں ندوہ کے مقاصد کی تبلیغ کی، اصلاح نصاب کی ضرورت سمجھائی اور عربی تعلیم کی اہمیت ذہن نشین کی۔(۳۵)

ان نتائج کے پس منظر میں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ آج ملک میں علم و تحقیق کی جو فضا بالخصوص تحقیقی مقالہ نگاری کا جو سلسلہ چلا وہ سب بہ راہ راست یا بالواسطہ علامہ شبلی ہی کا فیضان ہے۔

۱۹۱۲ء میں سید میر جان نے لکھنؤ سے مسلم گزٹ جاری کیا جو دراصل علامہ شبلی ہی کی تمام ترکوششوں کا نتیجہ تھا، اس کی تفصیل حیات شبلی میں موجود ہے(۳۶)، ہندوستان میں مسلمانوں کا اب تک کوئی آزاد اخبار نہیں ہے جو ان کے خیالات کی ترجمانی کر سکے، مولانا شبلی کی بصیرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کو اس زمانہ میں اس کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ انہوں نے اس کا نہ صرف مشورہ دیا بلکہ اس کی ذمہ داری بھی قبول کی، مولوی وحید الدین سلیم کو علی گڑھ سے بلا کر ایڈیٹر بنایا، متعدد مضامین اور نوٹ لکھے، ان کوششوں کی وجہ سے بہت جلد مسلم گزٹ مقبولیت کے آسمان پر چمک اٹھا۔

علامہ شبلی نے اس زمانہ میں ملی مسائل پر جو مضامین لکھے وہ اسی اخبار میں شائع ہوئے،

فتنہ ارتداد کی لہر اٹھی تو تمام برادران اسلام کی خدمت میں اس اخبار کے ذریعہ نومسلموں کو دوبارہ ہندو ہوجانے سے بچانے کی اپیل کی، مجلس علم کلام کی تجویز بھی اسی اخبار کی زینت بنی اور ان کا شاہ کار سیاسی مقالہ مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ اسی اخبار کے صفحات پر شائع ہوا جس نے مسلمانوں کی سیاسی فکر میں ایک انقلاب برپا کردیا۔

مسلم گزٹ کے گو ایڈیٹر مولوی وحید الدین سلیم رہے تاہم عملاً اس کے مدیر علامہ شبلی ہی تھے، ان ہی کی تجاویز اور مشوروں سے یہ نکلتا تھا، یہی وجہ تھی کہ اس زمانہ میں یہ عام خیال پیدا ہوگیا تھا کہ یہ علامہ شبلی ہی کا اخبار ہے۔(۳۷)

اس اخبار کے ذریعہ علامہ شبلی نے مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور ملی جذبہ برانگیختہ کرنا چاہا اور اس میں وہ بہت کامیاب رہے، دراصل یہی وہ صور تھا جو بعد میں الہلال نے پھونکا۔

آخر عمر میں جب علامہ شبلی سیرۃ النبی کی تالیف و تدوین اور دارالمصنفین کی بناء و تاسیس میں مصروف تھے، انہیں ایک علمی رسالہ "معارف" کے اجرا کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ انہوں نے اس کا خاکہ اور اس کے اغراض و مقاصد پر مشتمل ایک نوٹ لکھا جو ان کی ایک قلمی یادداشت میں اس طرح محفوظ ہے:

۱- نام: معارف۔

۲- چیف ایڈیٹر: شبلی۔

۳- اسٹاف: مولوی سلیمان، مولوی عبدالماجد، مسٹر حفیظ، مولوی عبدالسلام۔

۴- تعداد صفحات، تقطیع و کاغذ: ۲۹x۲۰، ضخامت ۴۰ صفحے، قیمت ۳ روپے۔

۵- متنوعات مضامین: فلسفہ، تاریخ قدیم و جدید، سائنس۔

۶- ادبیات: شعر، اردو شاعری کی تاریخ اور اسالیب۔

۷- اقتباسات: مجلات علمیہ یورپ اور مصر و بیروت۔

۸- فن تعلیم: کتب نادرہ کا ذکر اور ان کے اقتباسات یا ان پر اظہار رائے۔

۹- تنقید: کتب یا علوم قدیمہ پر۔(۳۸)

مگر ابھی معارف کا اجرا نہ ہوسکا تھا کہ ان کا وقت موعود آپہنچا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کی وفات کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی کی خواہش اور خیال کے مطابق جولائی ۱۹۱۶ء میں ماہنامہ ''معارف'' جاری کیا، علامہ شبلی نے مختصراً اس کے جو اغراض و مقاصد تحریر کئے تھے، سید صاحب نے تفصیل سے اس کی وضاحت کی اور ایک علمی رسالے کی ضرورت کا ذکر کیا۔(۳۹)

۱۹۱۶ء سے آج تک معارف علامہ شبلی کے قائم کردہ نہج پر بلاناغہ نوے برس سے شائع ہو رہا ہے، سیکڑوں موضوعات پر ہزاروں علمی و تحقیقی نگارشات شائع ہوچکی ہیں، برصغیر کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں مل سکتی، آج اس کی حیثیت کسی معرکتہ الآرا انسائی کلوپیڈیا سے کم نہیں، اس کی اہمیت شاعر مشرق علامہ اقبال کے اس قول سے واضح ہے کہ ''معارف ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے''(۴۰)، عبدالمجید سالک کے بہ قول ''معارف بلامبالغہ دنیائے اسلام کا بہترین علمی و تحقیقی رسالہ ہے اور جس نے ہماری تاریخ و تحقیق کے ذخیرہ کو مالا مال کیا ہے''(۴۱) اور آخر میں عالم اسلام کے مایہ ناز محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم نے اسے ہماری تاریخ حال کا مستقبل میں ایک وثیقہ اور ماخذ قرار دے(۴۲) کر ثابت کردیا کہ معارف کی قدر و منزلت کسی دور میں کم نہیں ہوئی، بلاشبہ یہ سب علامہ شبلی ہی کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔

حوالے

(۱) مکاتیب شبلی، ج ۱، ص ۱۴۵، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڈہ، ۱۹۲۸ء (۲) محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین، علی گڑہ، جنوری ۱۸۹۶ء، ٹائٹل کا صفحہ ۲ (۳) ایضاً (۴) مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۱۶۲، دارالمصنفین ایڈیشن، طبع چہارم (۵) محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین، علی گڑہ، جنوری ۱۸۹۶ء، ص ۲۵ (۶) ایضاً، مئی ۱۸۹۶ء، ص ۲۱۶ (۷) ایضاً (۸) مکاتیب شبلی، ج ۱، ص ۱۴۳، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین، اعظم گڈہ ۱۹۲۸ء (۹) ایضاً ص ۱۴۵ (۱۰) ایضاً ص ۱۴۳ - ۱۴۵ (۱۱) علامہ شبلی کے ساتھ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی بھی ایڈیٹر تھے (۱۲) نقوش لاہور، مکاتیب نمبر، ص ۱۸۴، ادارۂ فروغ اردو لاہور، نومبر ۱۹۵۷ء، مدیر محمد طفیل (۱۳) ماہنامہ الندوہ لکھنو، اکتوبر ۱۹۰۴ء، آخری صفحہ ٹائٹل (۱۴) ایضاً (۱۵) حیات شبلی، ص ۸۱۰

(۱۶) ایضاً، ص ۱۴۱ (۱۷) مکاتیب شبلی، ج ۲، ص ۲۰۹ بنام مہدی افادی (۲۹) (۱۸) مکاتیب شبلی، ج ۲، ص ۶۸، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڈہ، ۱۹۷۱ء (۱۹) مکاتیب شبلی، ج ۲، ص ۶۲ و ۶۴ (۲۰) نقوش لاہور، مکاتیب نمبر، ص ۱۸۵ (۲۱) ایضاً (۲۲) مکاتیب شبلی، ج ۲، ص ۷۰ (۲۳) ماہنامہ الندوہ لکھنو، مارچ ۱۹۱۰ء، ص ۶ (۲۴) مکاتیب شبلی، ج ۲، ص ۱۴۹ (۲۵) ماہنامہ الندوہ، اپریل ۱۹۱۰ء (۲۶) دلگداز، جون ۱۹۱۰ء، ص ۶ - ۸ (۲۷) مکاتیب شبلی، ج ۲، ص ۴۳ (۲۸) ایضاً ص ۷۲ (۲۹) المامون پر مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی نے سخت تنقید کی تھی جس کے جواب میں علامہ نے ایک مراسلہ لکھا تھا جو آزاد اخبار لکھنو کی ۲۲ر فروری ۱۸۸۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا (۳۰) مکاتیب شبلی، ج ۲، ص ۶۷ (۳۱) ایضاً (۳۲) ایضاً، ص ۷۸ (۳۳) الندوہ، اکتوبر ۱۹۰۷ء، ص ۱ - ۲ (۳۴) مکاتیب شبلی، ج ۲، ص ۵۶ - ۱۱۱ (۳۵) حیات شبلی، ص ۴۴۰ (۳۶) ایضاً، ص ۶۱۱ (۳۷) ایضاً، ص ۶۱۳ (۳۸) قلمی یادداشت، مخطوطہ دارالمصنفین اعظم گڈہ (۳۹) شذرات ماہنامہ معارف، جولائی ۱۹۱۶ء (۴۰) اقبال نامہ حصہ اول، مکتوب بنام سید سلیمان ندوی، ص ۸۰، مطبوعہ لاہور (۴۱) ماہ نو کراچی، جنوری ۱۹۵۴ء، ص ۲۵ (۴۲) ماہنامہ معارف، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۴۷۱، مکتوب پیرس۔

❁❁❁❁

قدیم پورنیہ شہر (پورنیہ سٹی) کے تاریخی کتبات

از:- جناب اکمل یزدانی جامعی صاحب ☆

وجہ تسمیہ پورنیہ کا قدیم نام پورنیہ تھا، یہ آج کل ریاست بہار کے ایک ضلع کا نام ہے مگر ماضی قریب میں پورنیہ صدر، کشن گنج، کٹیہار، اررریہ، مدھے پورہ اور اتر دیناجپور کے مجموعہ کا نام تھا۔

۱۸۱۳ء سے قبل مغربی بنگال کا ضلع مالدہ اور گور و پنڈوہ بھی اسی ضلع میں تھا، یہ وہی گور ہے جس کے متعلق ابوالقاسم فرشتہ نے لکھا ہے کہ "از مصر بہتر بود" اس کی بنیاد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے بھی سات سو تیس سال قبل پڑی، اگر یہ صحیح ہے تو ماننا پڑے گا کہ گور پاٹلی پترا سے بھی پہلے موجود تھا۔

یہ نو آباد ضلع نہیں پورنیہ کوئی نو آباد ضلع نہیں ہے، ست جگ سے اس کے آباد ہونے کا ثبوت اس کے بعض کھنڈرات دیتے ہیں، جیسے ہرنا کشیپ یا کنس راجہ کا وہ استھ جس میں اپنے لڑکے پرہلاد کو اس نے باندھ کر سزا دی تھی، بن منکھی کے دھر ہرا سکلی گڈھ مقام پر اب بھی موجود ہے۔(۱)

عہد مہابھارت کی یادگاریں اسی طرح عہد مہابھارت کی بھی یادگاریں ہیں۔

یہی وہ ضلع ہے جس کے ایک حصہ بیراٹھ دیس میں پانچوں پانڈوں نے رانی دروپدی کے ساتھ اگیات باس (روپوشی کا سال) گزارا، کیچک راجہ کا بدھ (قتل) یہیں ہوا جس کا ثبوت

(1) Notes on Maniktham monolith - Proceedings of A.S.B. 1890 – pp- 243-5 – O Malley I.S.C -Bengal D.Gazetter Purnea pp-180-8

☆ شیخ الحدیث لائبریری، امام نگر، میور منزل، پوناسی، پوسٹ سونتھا، ضلع کشن گنج بہار۔

بن کیچک بدھ نامی مقام ہے جو آج بھی زائرین کا مرجع ہے۔(۱)

عہد قدیم یہ ضلع عہد قدیم میں پنڈروں اور انگوں کے زیر تسلط رہا، پھر گوتم بدھ کے عہد میں (۵۱۹) قبل مسیح مگدھ حکومت میں ملا لیا گیا، پھر اس پر گپت خاندان کا قبضہ ہوا، ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں گور کے راجا ماسنکا نے اس پر حکومت کی، ۶۶۰ھ میں مگدھ کے راجا جیت سین کے تحت آ گیا، نویں صدی سے بارہویں صدی تک اس پر پال راجاؤں کی حکومت رہی، پھر سین خاندان کے زیر نگیں آ گیا۔(۲)

بارہویں صدی کے خاتمہ اور تیرہویں صدی کے شروع میں یہ خطہ مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔(۳)

عہد مغلیہ میں یہ خطہ ایک عظیم عسکری سرحدی سرکار (The Great Military Provinee) تھا اور اس کی طاقت بہت بڑھی ہوئی تھی، اس کے فوج داران بڑی حد تک خود سر تھے، صوبہ داران بنگالہ برائے نام حکم راں تھے، ان فوج داروں نے اپنا دارالحکومت شہر پورینیہ (پورنیہ) کو بنایا، پورینیہ پورین سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں کنول، اس مقام اور پورے پورنیہ ضلع میں کنول اور پانی میں کھلنے والے پھولوں، ہیلا، کوکا جس کو فارسی میں نیلوفر کہتے ہیں کی بہتات تھی اور اب بھی ہے (۴)، پھولوں کی کثرت کا ذکر مہابھارت میں بھی ہے۔(۵)

فوج داروں کا عہد یہ شہر فوج داروں کے عہد میں نو مربع میل پر پھیلا ہوا تھا اور اس کے چالیس محلے تھے، بکانن ہملٹن کے مطابق اس شہر میں چالیس مسجدیں تھیں۔

سترہویں صدی سے پہلے یہاں کن فوج داروں نے حکومت کی، اب تک پتہ نہیں چل سکا ہے مگر سترہویں صدی کے اخیر میں استوال خاں عامل اور فوج دار ہوا، پھر یکے بعد دیگرے تقریباً اٹھارہ فوج داروں نے اس پر حکومت کی جن میں اسفندیار خاں، بہمن یار خاں، سیف خاں،

(۱) ٹھاکر گنج ضلع کشن گنج سے تقریباً ۲۰ میل پورب اتر - بنگال ڈسٹرکٹ گزیٹیر پورنیہ او مالی، ص ۳۳۔
(۲) پورنیہ پر فوج داروں کی حکومت از اکمل یزدانی جامعی، ص ۴ (۳) طبقات ناصری، ص ۱۶۴ (۴) گل یاسمین دہیلا و گل سرج وغیرہ گلہائے خوشبو بسیار دارد (ریاض السلاطین، ص ۴۴) (۵) پانڈوں نے جب بناس جی سے اگیات باس کا ذکر کیا تو کہا بیراٹھ کے دیس میں ضرور جانا وہاں شہد اور پھولوں کی کثرت ہے۔

صولت جنگ، شوکت جنگ نامی گرامی فوج دار گزرے ہیں۔(۱)

سیف خان سیف خان کابل کے مشہور حکم راں امیر خاں میر میراں کا لڑکا اور امیر خاں انجام کا بھائی تھا، اس نے لگ بھگ بتیس سال سے زیادہ پورنیہ پر حکومت کی، وہ ضلع کی توسیع، انتظام حکومت، تدبر اور شجاعت میں بے مثل تھا، صولت جنگ اور اس کے بیٹے شوکت جنگ مربیان علم و ادب گزرے ہیں، صاحب سیر المتاخرین غلام حسین طباطبائی دونوں کے دربار سے وابستہ رہے، ملا غلام یحییٰ بہاری، مفتی ضیاء اللہ، میر وحید، مولوی لعل محمد، شیخ ہدایت اللہ، سید عبدالہادی، روشن میر باقر حزیں، صولت جنگ کی رفاقت میں رہے۔(۲)

آخری فوج دار پورنیہ کا آخری فوج دار آغا محمد علی مائل شیرازی تھا جس نے ۱۷۷۰ء تک فوج داری کی۔

افسوس ناک بات قدیم پورنیہ ضلع میں ہندو عہد کے قلعہ جات، عمارتوں کے کھنڈرات اور دیگر تاریخی یادگاروں کی بہتات ہے اور مسلم آثار وصنادید کی بھی کمی نہیں مگر ہنوز ان پر سرکاری سطح پر اور نہ غیر سرکاری طور پر کوئی خاص کام ہو سکا ہے سوائے معدودے چند کے، ضرورت ہے کہ ان تاریخی یادگاروں کو محفوظ کرلیا جائے، کام چوں کہ پھیلا ہوا ہے اور کسی ایک کے بس کا نہیں ہے، ناکارہ عرصہ دراز سے پورنیہ پر کام کرنے کے باوجود اس پر قابو نہیں پا سکا ہے، کتبوں کو چوں کہ تاریخی کام میں بے حد اہمیت حاصل ہے لہذا اس کو مقدم سمجھتے ہوئے ان کی نقلیں لینے کی کوشش جاری ہے، جہاں جہاں تاریخی عمارتوں، مندروں، مسجدوں اور مقبروں میں کتبے مل سکے ہیں محفوظ کرتا جا رہا ہوں۔

اس مضمون میں صرف ان ہی کتبوں کا ذکر کیا جائے گا جو مجھے قدیم پورنیہ شہر (پورنیہ سٹی) اور اس کے مضافات میں مل سکے ہیں، اللہ نے توفیق دی تو آئندہ دوسرے کتبات بھی پیش کئے جائیں گے، انشاء اللہ۔

نقل کتبہ (۱)

مزار شریف حضرت سید محمد عرف بابو رام باغ پورنیہ سٹی

بسم اللہ الرحمن الرحیم، الحمد للہ الذی بنی السموات عالیۃ

(۱) اومالی بنگال ڈسٹرکٹ گزیٹیر پورنیہ ص ۳۵ (۲) سیر المتاخرین اردو ترجمہ، جلد ۲، ص ۲۴۵۔

والارض طاحیۃ والصلوۃ علی نبیہ المصطفی محمدن المجتبی وعلی آلہ الھادین واصحابہ الراشدین، امابعد فقد بنی ھذہ الروضہ الشریفۃ العبد الراجی المخاطب بہ بلیان شاہ لقاہ اللہ تعالی بالعز والجاہ ابن شیخ حسین صفاہ اللہ کماء اللجین ابن میاں شیخ شفاء اللہ بالشیخ (؟) ابو العز شیخ سعد اللہ غفرہ اللہ لسیدی محمد عرف بابو نجرا من عندہ بالصدق وثوا بالعھد السلطان العادل الباذل غیاث الدنیا والدین ابو المظفر محمود شاہ السلطان ابن حسین شاہ السلطان ابن السید شرف الحسینی خلد اللہ ملکہ وسلطانہ فی التاریخ الرابع من ذی القعدہ سنۃ ثلث واربعین وتسع مایۃ۔

ترجمہ: بسم اللہ الرحمن الرحیم، سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے آسمانوں کو بلند اور زمین کو پست بنایا اور صلوہ وسلام اس کے چہیتے نبی ﷺ پر اور ان کے آل واصحاب پر۔

اس روضہ شریفہ کو اس کے (اللہ کے) عبد راجی نے بنایا جس کا خطاب بلیان شاہ ہے، اللہ تعالی اس کو عزت وجاہ سے ممتاز فرمائے، ابن میاں شیخ مسمی ابوالعز سعد اللہ غفرلہ واسطے اپنے پیر سید محمد عرف بابو۔

یہ عہد سلطان العادل الباذل غیاث الدنیا والدین ابو المظفر محمود شاہ السلطان ابن حسین شاہ السلطان ابن السید شرف الحسینی خلد اللہ ملکہ وسلطانہ بہ تاریخ ۴ر ذی قعدہ ۹۴۳ھ = (۱۴ر اپریل ۱۵۳۷ء)۔

یہ سلطان محمود شاہ حسین شاہ (بنگالہ)، یہ بنگال کے آخری خود سر سلطان تھے، ان کا عہد ۱۵۳۳ء تا ۱۵۳۷ء ہے، ڈاکٹر قیام الدین صاحب پٹنہ لکھتے ہیں کہ اس خود سر سلطان بنگالہ کا یہ واحد کتبہ ہے جو بہار میں دست یاب ہوا ہے، ان کے اور تین کتبے ملے ہیں مگر سب کے سب بنگال میں ملے ہیں، شاید اس کے عہد کا یہ آخری کتبہ ہے۔(۱)

(1) Some un published pre - Mughal inscriptions from Bihar by Dr Q. Ahmad. pp-14-16

سید محمد عرف بابوؒ کا وصال ۹۴۳ھ میں یا اس سے قبل سلطان محمود شاہ بن حسین شاہ بن شرف الحسینی سلطان بنگالہ کے عہد میں ہوا، ان کے مرید یا خلیفہ بلیان شاہ تھے بلیان شاہ کا سلسلہ نسب اس طور پر ہے:

بلیان شاہ بن شیخ حسین بن میاں شیخ بن ابو العز شیخ سعد اللہ۔

بلیان شاہ نے روضہ شریف کو بنوایا، یہ کتبہ ۴/ ذی قعدہ ۹۴۳ھ مطابق ۱۴/ اپریل ۱۵۳۷ء کو نصب کیا گیا۔

یہ سنگی لوح مزار پورنیہ سٹی کے کیونلا پور محلّہ کے میر نیر علی کی خاندانی پختہ مسجد کے صحن میں رکھا ہوا ہے، میر نیر علی صاحب مرحوم نے راقم الحروف سے فرمایا تھا کہ ان کے والد محترم میر فیاض علی خاں بہادر کو شکار کے دوران یہ پتھر ریلوے لائن کے اطراف میں جنگل میں پڑا ہوا ملا تھا، ۱۹۵۳ء میں راقم نے اس کو دیکھنے اور نقل کرنے کے بعد پروفیسر سید حسن عسکری پٹنہ اور پروفیسر قیام الدین پٹنہ کو اس کی خبر کر دی تو انہوں نے بھی آ کر اس کو دیکھا اور نقلیں لیں، اس کا ذکر نقل معہ ترجمہ انگریزی Some unpublished Mughal inscriotions from Bihar. Epigraphia Indica Arabic and Persian Suppliment 1968 pp 14-15 میں انہوں نے شامل کر دیا ہے۔

لہٰذا اس کتبہ کی روشنی میں یہ بات بالکل صاف ہے کہ حضرت سید محمد عرف بابو کے رشد و ہدایت کا سلسلہ اطراف پورنیہ میں ۹۴۳ھ/ ۱۵۳۷ء سے قبل چل رہا تھا، ان کی خانقاہ بھی پورنیہ شہر ہی میں رہی ہوگی، ان کے وصال کے بعد ان کے مرید یا مرید و خلیفہ سجادہ نشیں بلیان شاہ نے اس سلسلہ کو جاری رکھا ہوگا۔

سید محمد عرف بابو اور بلیان شاہ کس سلسلے کے بزرگ تھے، ہنوز معلوم نہ ہو سکا، جستجو جاری ہے، اللہ کامیاب فرمائے، یہ نام بلیان شاہ بھی قابل غور ہے پتہ نہیں اسی ملک کے باشندہ تھے یا کسی اور ملک کے۔

آخری فوج دار پورنیہ محمد علی خاں مائل شیرازی کے مزار کا کتبہ

پورنیہ کے آخری فوج دار آقا محمد علی خاں بہادر محمد رضا خاں بہادر مظفر جنگ نائب ناظم

بنگالہ کے بھائی اور حکیم ہادی علی خاں عقیلی شیرازی کے لڑکے تھے۔

خود بھی شاعر تھے، مائل تخلص فرماتے تھے، علم و ادب کے مربی و سرپرست محمد علی خاں مائل کی وفات ۱۲۱۷ھ میں ہوئی اور محلّہ ناگیر باغ عبد اللہ نگر خشکی باغ پورنیہ کے قبرستان میں مدفون ہیں، یہ قبرستان خشکی باغ میں کٹیہار موڑ سے کچھ دور پورب کا رہا گولہ دارجلنگ روڈ سے دکھن واقع ہے، کتبہ سنگ سیاہ پر کندہ ہے۔

(نقل کتبہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سالکاں را رہنمائے نیست جز پیر مغاں   عاقبت مائل بہ گاہش پناہے برد و رفت

مقطع مرقومۃ الفوق من غزلیات مائل شیرازی لیتی ہذا المدفون مرحوم مغفور حسب الوصیت تسوید یافت۔

امیر خرد مند فیاض دوراں   چو شد زیں جہاں سوئے جنت خراماں
بعظیم تاریخ او گفت رضواں   بفردوس آ اے محمد علی خاں

۱۲۱۷ھ

کتبہ مزار احمد علی خاں بہادر پسر محمد علی خاں بہادر فوج دار پورنیہ

احمد علی خاں بہادر پورنیہ کے آخری فوج دار محمد علی خاں بہادر کے صاحب زادہ تھے، ان کی وفات پنجم شہر ذی قعدہ ۱۲۵۸ھ روز پنج شنبہ کو ہوئی جو مطابق ۲۴/ ماہ اگہن ۱۲۵۰ فصلی ہے، وہ بھی متذکرہ بالا قبرستان ناگیر باغ عبد اللہ نگر میں مدفون ہیں، ستر سال کی عمر پائی لہٰذا سنہ پیدائش تقریباً ۱۱۸۸ھ ہے۔

اے دریغ احمد علی خاں بہادر اے دریغ   زیں جہاں فانی مغرور شد
زیست در دنیا چہ او ہفتاد سال   بر تماشائے جہاں مامور شد
زیں فضیلت بر ہمہ اہل جہاں   روز روشن چو شب دیجور شد
زیں خراب آباد از اندوہ و رنج   رفت او و از اجبا دور شد
جبرئیل از بہر دفنش در بہشت   در پئے استبرق و کافور شد

از فروغ روح او عالی جناب   جنت الماویٰ سراسر نور شد
گفت تاریخ وفاتش پیر عقل   با علی و مصطفےٰ محشور شد
در ہزار و دو صد و پنجاہ و ہشت
رفت در جنت کنارہ حور شد

تاریخ پنجم شہر ذی قعدہ ۱۲۵۸ھ روز پنجشنبہ مطابق بست و چہار ماہ اگہن ۱۲۵۰ ملکی۔

مادھو پارہ کی مسجد کا کتبہ

مادھو پارہ اب جدید شہر پورنیہ کا حصہ ہے مگر پہلے قدیم شہر پورنیہ سٹی کا حصہ تھا، یہ جگہ لائن بازار پورنیہ سے پورب ہے، اس کا پرانا نام روئی گولہ ہے کیوں کہ روئی کی منڈی تھی اور مالدہ، دیناجپور وغیرہ سے بھی بیوپاری روئی خریدنے یہاں آتے تھے۔

۱۲۶۵ھ میں ضمیر اللہ صاحب نے یہاں ایک سہ گنبدی مسجد بنائی، اس کی لمبائی باہر سے ۵۰ فٹ اور چوڑائی ۲۱ فٹ ہے، دیواروں کی موٹائی ۳۴-انچ ہے، ایک وقف نامہ سے پتہ چلتا ہے کہ ۲۹/اپریل ۱۸۸۱ء مطابق ۱۸/بیساکھ ۱۲۳۹ ملکی میں بی بی گمانی بیگم بنت امیر خاں مرحوم ساکن مینڈھا خانہ قصبہ پورنیہ نے ۵ ہزار کی جائداد وقف کی جس کا مقصد مرمت مسجد و مقبرہ و فاتحہ خوانی و دیگر کار حسنہ تھا، انہوں نے بدیع الزماں خلف منیر اللہ ساکن مادھو پارہ کو متولی بنایا، یہ منیر اللہ بانی مسجد ضمیر اللہ کے بھائی تھے، گمانی بیگم لاولد تھیں، اب مولوی علاء الدین صاحب مرید شیخ الاسلام نے مسجد کی توسیع کرائی ہے اور مدرسہ بھی قائم کیا ہے، کتبہ کی نقل یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا إله الا الله محمد رسول الله، واتخذوا من مقام ابراهيم مصلى

بیا اے عابد و ارباب اوراد   کہ معبود از عبادت می شود شاد
شنیدا فضل علی از ملہم غیب   ضمیر اللہ بنائے مسجدے داد
۱۲۶۵ھ

از مصرعہ چہارم کہ مادہ تاریخ است بحساب ابجد ۱۲۶۵ھ برمی آید۔

کتبہ مسجد جنت النساء خانم اسمتھ بازار پورنیہ سٹی

یہ سہ گنبدی مسجد پورنیہ سٹی میں پورنیہ قصبہ پچ روڈ سے متصل پچھم اور ہائی اسکول پورنیہ سٹی سے اتر سڑک کے واقع ہے، لمبائی ۳۷ فٹ اور چوڑائی ۱۲ فٹ ہے، دیوار کی موٹائی ۲½ فٹ ہے، چاروں کونوں پر چار بڑے اور اگلی اور پچھلی دیوار کے وسط میں دو چھوٹے مینارے ہیں جن میں پیتل کے کلس لگے ہیں، صحن وسیع ہے اور پختہ چہار دیواری کے اندر ہے، مسجد میں تین دروازے ہیں، بیچ کے دروازے کے دائیں جانب اوپر دیوار پر سفید پتھر پر خوش خط حروف میں مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہیں:

یا اللہ

کرد تعمیر مسجدِ اعلیٰ   مومنہ محسنہ دریں عالم
گشت ہم شکل مسجدِ اقصےٰ   طاق و محراب و ممبرش باہم
پیٔ تاریخ آں بشارت شد
گفت حق جنت النساء خانم
۱۲۸۶ھ

پورنیہ سٹی کے ایک مندر کا فارسی کتبہ

پورنیہ سٹی میں چاندنی چوک سے پورب تھانہ کی طرف جانے والی سڑک کے اتر سڑک کے بالکل کنارے پر ایک مندر ہے، جس کے داخلی دروازے پر سنگ مرمر پر مندرجہ ذیل فارسی اشعار کندہ ہیں، یہ مندر بابو رام چندر نے ۱۲۷۲ ملکی میں بنوایا ہے:

مصدر حسنات وجود و فیض بابو رامچندر   پورنانک بخش صاحب منشی جادو رقم
کرد بر مندل بنا چوں بہر کسب فیض خلق   بہر تاریخش جائے گفت آں والا ہمم
سال ملکی را بہ صنعت صوری و معنوی   خواستم بر صفحہ قرطاس بنویسد قلم
اندر آں دم سال استھاپن چو خوش ہاتف بگفت
یک ہزار و دو صد و ہفتاد و دو کن رقم
۱۲۷۲ ملکی

اسی مندر کا دوسرا کتبہ:

پورنیہ سٹی کے جس مندر کا فارسی کتبہ نقل کیا گیا اسی مندر کے اندر جو ٹھاکر باری ہے، اس میں داخل ہونے سے پہلے مندرجہ ذیل اردو کتبہ نظر آئے گا، جس سے ٹھاکر باری کی استھاپنا کی تاریخ اور سن معلوم ہوتا ہے:

جب بھگت اوپر ہوئی کرشن کرپا — تب عرصۂ چند میں کیا ہے بنا
ہری مندل خوب و لطیف بہت — گو لوگ کہوں بیکنٹھ ہے پا
یہی حیرت تھی کہ پھر اوسیدم مجھے — سال دل میں خیال ہوا
دل صاف سے ملہم غیب مجھے — جی رادھا کرشن مُراری کہا

بہ تاریخ چیت سودے دسمی سمبت ۱۹۲۲ مطابق ۲۴ ماہ چیت ٹھاکر باری تیار ہو کے استھاپن سری سری ٹھاکر جی (جیو) کا ہوا۔

سونرا پل پورنیہ سٹی کا کتبہ

قدیم پورنیہ شہر (پورنیہ سٹی) اور جدید شہر پورنیہ کو ملانے والا پل جو سونرا پل کہلاتا ہے، ملکہ وکٹوریہ کے عہد کی یادگار ہے، یہ پل اینٹ اور سرخی چونہ سے بنا ہوا ہے اور سولہ محرابوں پر مشتمل ہے، سونرا ندی پر بنے ہوئے ہونے کے سبب سونرا پل مشہور ہے، اس پل پر اتر جانب پوربی دیوار پر ایک سفید پتھر نصب ہے جس پر انگریزی، اردو، بنگالی اور دیوناگری رسم الخط میں عبارتیں کندہ ہیں، یہ پل یکم جنوری ۱۸۷۶ء میں بننا شروع ہوا اور ۳۰ ردسمبر ۱۸۷۸ء میں تیار ہوا، رچرڈ ٹمپل لفٹنٹ گورنر بنگال کی سرپرستی اور مسٹر جی - این بارلوی - ایس - آئی کمشنر بھاگل پور کی اور مسٹر ڈبلو کیمبل مجسٹریٹ وکلکٹر ضلع پورنیہ کی نگرانی میں بنا، نصف اخراجات بابو نکچھیدی لال اور نصف بابو مہیش لال نے برداشت کیے۔

کتبہ کے اردو حصہ کی نقل حسب ذیل ہے:

باقبال جناب سلطنت مآب شہنشاہ جہاں پناہ ملکہ معظمہ وکٹوریہ قیصر ہند کے عہد آنریبل رچرڈ ٹمپل صاحب لفٹنٹ گورنر بنگال کے سرپرستی سے جناب جی - این - بارلوی - ایس - آئی انڈیا کے تائید و مدد سے کیمبل صاحب کلکٹر و مجسٹریٹ چیرمین ......نصف خرچ سے بابو نکچھیدی لال

کے و نصف خرچ و محنت و جاں فشانی و ...... سے بابو مہیش لال نصف یہ پل سورا پر پورنیہ ضلع کے تاریخ ارجنوری ۱۸۷۶ء سے شروع ہو کر تاریخ ۳۰ ردسمبر ۱۸۷۸ء میں طیار ہوا۔

اس پل میں کوئی قسم کا ٹیکس بہ موجب نوٹس میونسپلٹی کمشنران کے نہیں لیا جائے گا، صرف کار خیر فی اللہ کے واسطے بنایا گیا، فقط۔

کتبہ ڈاکٹر فلور ایم ڈی

Sacred to the memory of P.I.Flor. M.D. ,Who died at Purnea the 28th Aug 1778.

بہ تاریخ پانزدہم ماہ بہادوں ۱۱۸۵ بنگلہ ڈاکٹر فلور صاحب ازیں جہانِ فانی بہ عالم جاویدانی رحت نمودہ

مسٹر براؤن کی قبر کا کتبہ

Sacred to the memory of John. W. Brown, who died sept 1788. aged 56 years.

بتاریخ چہاردہم ماہ بہادوں ۱۱۹۵ بنگلہ مسٹر براؤن صاحب ازیں جہاں فانی بہ عالم جاویدانی رحلت نمودہ۔

(تاریخ وفات بنجمن بلیک صاحب)

(اوپر انگریزی میں کافی لمبی عبارت کندہ ہے اور نیچے فارسی میں یہ لکھا ہوا ہے:)

تاریخ وفات بنجمن بلیک صاحب

بست و چہار ماہ اگست ۱۸۲۰ء مطابق دہم ماہ بہادوں ۱۲۰۷ بنگلہ روز شنبہ در ضلع پورنیہ بہ عمر شصت و پنج سال ازیں جہاں فانی بسرائے جاودانی انتقال نمودند۔

(کتبہ قبر جارج پالمر صاحب)

اوپر انگریزی میں لکھنے کے بعد نیچے درج ہے:

ہذا المدفون مسمی جارج پالمر بہ تاریخ دہم ستمبر ۱۸۴۰ء روز پنجشنبہ بسن چہل و چہار سال انتقال نمودند۔

شوری شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شبِ فتنہ غنودیم

جارج پالمر کلکتہ کے جان پالمرز کے رشتہ داروں میں تھے، جارج پالمر اور ان کے بھائی چارلس پالمر ۱۸۱۱ء میں پورنیہ آئے، چارلس پالمر اور ان کے خاندان کی قبریں ہوائی اڈے سے پچھم ہیں اور جارج پالمر کی قبر پورینہ ہسپتال سے پورب عیسائیوں کے گورستان قدیم میں ہے، راقم نے وہاں کے کتبوں کی نقلیں لی ہیں، پورنیہ میں عیسائیوں کے چار بڑے گورستان Grave Yards ہیں، جارج پالمر امیر غریب سب میں مقبول تھے، ان کی موت پر سب نے ماتم کیا جیسا کہ کتبہ (انگریزی) سے ظاہر ہوتا ہے۔

چارلس پالمر کی لڑکی مسماۃ میری اِن کی قبر کا کتبہ

"مسماۃ میری اِن بنت چارلس و ریاض النساء زوجہ پالمر واقع بتاریخ سے و یکم ماہ جنوری ۱۸۵۳ عیسوی برحمت حق پیوست"

واضح رہے کہ دو بھائی جارج پالمر اور چارلس پالمر تقریباً ۱۸۱۱ء میں پورنیہ آئے، جارج پالمر اور چارلس پالمر دونوں پورنیہ ضلع کے مشہور نیل کار اور زمین دار تھے، جارج پالمر کا انتقال ۱۸۴۰ء میں ہوا جن کی قبر کے کتبہ کی نقل پہلے درج کی گئی، چارلس پالمر کا انتقال ۱۸۷۳ء میں ہوا۔

چارلس پالمر چونکہ پرگنہ سرسیپور کا زمین دار تھا، اس نے سونتھا تھانہ بہادر گنج (موجودہ ضلع کشن گنج - بہار) کی ایک لڑکی ریاض النساء کا اغوا کر کے اس کو رکھ لینا چاہا، عوام میں کھلبلی بڑے زور سے مچی تو اس سے شادی کرنے اور اس کے نام جائداد لکھ دینے پر آمادہ ہوا، یہ قصہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے، بعض میں ریاض النساء نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا، چارلس پالمر اور ریاض النساء سے صرف ایک اولاد ہوئی جس کا نام میری اِن تھا جس کی قبر کے کتبہ کی نقل اوپر درج ہوئی، چارلس پالمر اپنی فیملی سمیت پورنیہ کالج سے تقریباً دو فرلانگ اتر پچھم اور ہوائی اڈے سے اتنا ہی پچھم ریلوے لائن سے اتر آم کے باغ میں اپنی نجی قبرستان میں مدفون ہیں۔

❀❀❀❀

اخبار علمیہ

سرکاری و غیر سرکاری مدرسوں میں قرآن کی تعلیم اور طلبہ کو ارکان و شعائر اسلام سے واقف کرانے کے لئے ایک الکٹرانک قرآن تیار کیا گیا ہے اور اسے ایک چھوٹی چپ میں فٹ کر دیا گیا ہے، ۴۰ زبانوں میں اس کی آڈیو نہایت دل کش آوازوں میں تیار کی گئی ہے، سعودی عرب کی حکومت کی سافٹ ویر کمپنی دار الرسم العثمانی جو اس پروجیکٹ پر کام کر رہی ہے، اس نے کہا ہے کہ عام فائدے کے لئے اس کو بازار میں نہایت مناسب اور ارزاں قیمت پر مہیا کرایا جائے گا اور جلد ہی وسط ایشیا کے سرکاری و غیر سرکاری اسکولوں کے طلبہ کی تعلیم کے لئے بھی روانہ کیا جائے گا اور وائرلیس کی مدد سے بھی یہ استعمال کیا جا سکے گا۔

برطانیہ کی فلپ اسٹار کمپنی نے دنیا کا سب سے چھوٹا لیپ ٹاپ تیار کیا ہے جو ایک پاؤنڈ وزنی ہے، اس کی لمبائی ۸،۵-۱ انچ، چوڑائی ۴-۱ انچ اور موٹائی ایک انچ ہے، اس میں IGHz کا پروسیسر نصب ہے، اس کی میموری 256 MB ہے اور 30 GB کی ہارڈ ڈسک ڈیٹا محفوظ کرنے کے لئے لگائی گئی ہے، ساتھ ہی تھری ڈی گرافکس کے لئے BMB ویڈیو ریم لگی ہے، کی بورڈ کمپیوٹر کے مانند ہے اور اس میں عام کمپیوٹر کی طرح فنکشن کیز بھی ہیں، اس کا اسکرین ۶،۵ ہے، پاور کے لئے لیتھیم آئن پولیمر بیٹری استعمال کی گئی ہے جو ۲ سے ۶ گھنٹہ چل سکتی ہے، اس میں چارجنگ سسٹم بھی ہے، نیز انٹیگریٹڈ مائیکروفون، اسپیکر ہیڈ، فون جک بھی ہے، ویڈیو میسیجر استعمال کرنے کے لئے اس میں 103 میگا پکسل کا کیمرہ بھی لگا ہوا ہے۔

مرکز الدراسات الثقافۃ الایرانیہ العربیہ طہران نے "ثقافتنا" کے نام سے ایک علمی اور سائنسی سہ ماہی رسالہ عربی زبان میں نکالا ہے، اس کی جلد ۳ شمارہ ۱۲ اس وقت پیش نظر ہے، اس رسالہ کی ۲ فائلیں (حصے) ہیں، پہلی فائل میں لبنان پر اسرائیلی حملے کے متعلق اداریے کے بعد ۴ صفحوں میں رسالے کے مضامین و مشمولات کا تعارف ہے، اس کے بعد علی اللہوردی خانی کے سفر حج کی روداد کی چوتھی قسط ہے، پھر "اسلاموفوبیا" کی اصطلاح پر مغرب کے حوالہ سے معلوماتی اور تجزیاتی گفتگو کی گئی ہے، فائل ۱ میں مہدی منتظر کے عقیدہ پر فلسفہ تاریخ کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اور فائل ۲ میں حلب کے مشہور صاحب قلم عبد الرحمان الکواکبی کے افکار و نظریات کا جائزہ لیا گیا

اور بتایا گیا ہے کہ ان میں اور سید جمال الدین کے کون سے خیالات مشترک تھے اور آخر میں اس کے ایڈیٹر علی آذرشب کے قلم سے طہران، بیروت، جامعہ طرابلس الشام وغیرہ میں منعقدہ کانفرنسوں کی مختصر رپورٹ ہے، رسالہ ظاہری و باطنی خوبیوں کا حامل اور جدید مسائل و موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، تاہم اس کا انداز غامض اور عسیر الفہم ہے، اسے عام فہم اور سہل بنانے کی ضرورت ہے۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایسٹرانومی اینڈ جیوگرافیکل ریسرچس، مصر کے شعبہ سولر اینڈ اسپیس ریسرچ کی تحقیق کے مطابق مکہ مکرمہ کرہ ارض کے وسط میں واقع ہے، شعبہ کی رپورٹ میں وثوق سے کہا گیا ہے کہ دنیا کے تمام براعظموں کی ایک دوسرے سے علاحدگی سے قبل نئے اور پرانے براعظموں کا مرکز مکہ مکرمہ ہی تھا، سرکل (دائرہ) کا ڈایامیٹر جو تمام پرانے براعظموں کو محیط ہے، تقریباً ۸ ہزار کلومیٹر ہے، جس کا مرکزی نقطہ (Center Point) مکہ مکرمہ ہے، نئے براعظموں میں آسٹریلیا، شمالی اور جنوبی امریکا، نیوزی لینڈ کے شہر ویلنگٹن اور مکہ کا درمیانی فاصلہ ۱۳۰۴۰ کلومیٹر ہے، مکہ سے جنوبی امریکا کے کیپ ہوم کا فاصلہ ۱۳۱۲۰، شمالی امریکا کا الاسکا ۱۳۰۶۰ کلومیٹر کی دوری پر ہے، ان نئے براعظموں کے شہروں کے درمیان فاصلہ کا اوسط ۱۳۲۵۳ کلومیٹر بنتا ہے جو بہت معمولی صرف ۲.۵ فیصد ہے، ویلنگٹن، الاسکا، کیپ ہارن نئی دنیا کے بالکل آخر میں واقع ہیں، ان کا اور مکہ کے درمیان کا فاصلہ برابر ہے، لہذا مکہ مکرمہ دنیا کے سرکل کا مرکز ہے جو تینوں نئے براعظموں کو محیط ہے، رپورٹ میں پوری تفصیل ہے، یہاں اس کی تلخیص کردی گئی ہے۔

شاہ فیصل اسپتال کے ریسرچ سنٹر میں آیوڈین ۱۲۴ طرز کی خاص قسم کے شعاع ریز شیشے کے دو الگ الگ شعبے ۱۹۸۶ء سے قائم ہیں، ان پاور گلاسوں کو کینسر کی بعض قسموں کی تشخیص اور علاج کے لئے یکساں طور پر استعمال کیا جاتا ہے، اس طبی آلہ نے امریکہ اور برطانیہ میں بڑی مقبولیت بھی حاصل کی ہے اور ادارے کو مختلف طبی انعامات اور توصیفی سندوں سے عالمی سطح پر نوازا جاچکا ہے۔

مسلم معاشرے میں سہولت پسندی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کو دیکھ کر سعودی عربیہ کی تنظیم "التوعیۃ الاسلامیہ" نے مختلف ملکوں میں صوتی لائبریریوں کے قیام کا منصوبہ بنایا ہے، اس کے جنرل سکریٹری نے اس کا مقصد یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں میں اسلامی بیداری اور صحیح اسلامی فکر و عقیدہ کی اشاعت ہو، ان صوتی لائبریریوں کے کیسٹس تلاوت کلام پاک، قرآن و

حدیث اور دینی موضوعات پر علمی مباحثوں، جدید اور عصری مسائل پر مستند مفتیوں کے فتووں اور علمائے اسلام کی تقریروں پر مشتمل ہوں گی جن سے مسلمانوں کی دینی معلومات میں اضافہ ہوگا اور وہ بہت معمولی اور نہایت ارزاں قیمت میں فروخت کی جائیں گی، خبر ہے کہ دو ہزار کیسٹس التوعیہ نے تیار کر کے مختلف بیرونی لائبریریوں اور دفتروں کو بھیج دی ہیں۔

حج کے لئے برابر کتابیں اور پمفلٹ شائع ہوتے رہتے ہیں، اب اسی غرض اور حاجیوں کی مزید سہولت کے لئے شبلی کالج اعظم گڈھ کے وظیفہ یاب لکچرر ڈاکٹر مرزا انصار بیگ صاحب نے بڑی جاں فشانی سے ایک چارٹ اردو زبان میں مرتب کیا ہے جو غالباً اپنے انداز کی پہلی کوشش ہے، چارٹ کے ایک طرف حج اور دوسری طرف عمرہ کا نقشہ دیا گیا ہے جس میں قیام گاہ سے روانگی سے لے کر مکہ و مدینہ تک پہنچنے و زیارت کی تمام کیفیات و مراحل کے بارے میں پوری رہنمائی کی گئی ہے اور خانہ کعبہ، مقام ابراہیم، مقام سعی، منی، عرفات، مزدلفہ وغیرہ کی تصویریں بھی آسانی کی غرض سے دے دی گئی ہیں اور حج کے پانچ دنوں کی مصروفیات مجملاً تحریر کردی گئی ہیں، اس اعتبار سے چارٹ خواص و عوام سب کے لئے مفید ہے، اس کی طباعت و اشاعت کا حق مرتب نے اپنے لئے محفوظ نہیں کیا ہے۔

فرانس کے شمال میں واقع شہر "لائل"، جس کی گیارہ لاکھ آبادی میں ۲۵ فیصد مسلمان ہیں، ابن سینا اسلامک انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا ہے، اس کی منظوری فرانسیسی حکومت سے حاصل کی گئی ہے، یہ پہلا اسلامی تعلیمی ادارہ ہوگا جس میں یونی ورسٹی سطح تک کی تعلیم کا نظم ہوگا اور فرانسیسی اور یورپی نصاب تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی موضوعات بھی داخل کیے جائیں گے، انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر محمد البشاری کے بیان کے مطابق آج اسلاموفوبیا کی اصطلاح اور اس کے کرشمے اپنے عروج پر ہیں، ایسے تعلیمی ادارے کی شدید ضرورت ہے جو مغربی معاشرے کے سامنے اسلام کی حقیقی تصویر پیش کرسکیں، رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اس کے مالی اخراجات کا بڑا حصہ حکومت قطر کے ذمہ ہے، ڈائریکٹر نے مزید کہا کہ آیندہ اس تعلیمی ادارے کو ایک یونی ورسٹی میں تبدیل کرنے کا عزم ہے جہاں ایسے مبلغین اور ائمہ تیار ہوں جو موجودہ حالات کے تقاضوں، مسائل اور مقامی افراد اور گروپوں کے مزاج، زبان اور تہذیب سے بہ خوبی واقف ہوں۔

ک ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

سید الطاف علی بریلوی نمبر

حبیب منزل،
میرس روڈ، علی گڑھ
۱۳؍جنوری ۲۰۰۷ء

مکرمی ومحترمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ماہ جنوری کا ''معارف'' کل موصول ہوا، شکریہ، اس میں ''العلم'' کراچی کے سید الطاف علی نمبر پر جو تبصرہ شائع ہوا ہے اس میں بعض واقعاتی غلطیاں جگہ پا گئی ہیں، براہ مہربانی میرا یہ مراسلہ آئندہ شمارے میں شائع کر دیں، تا کہ یہ غلط فہمیاں رفع ہو جائیں۔

۱- سید الطاف علی بریلوی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری کبھی نہیں رہے، وہ کانفرنس کے دفتر میں ملازم تھے اور ان کا عہدہ نگراں یا سربراہ دفتر کا تھا، وہ بلاشبہ ایک لائق اور مستعد کارکن تھے اور ان کی کارکردگی سے کانفرنس کو بہت فائدہ پہنچا تھا بالخصوص کانفرنس کے سکریٹری نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کو ان پر بہت اعتماد تھا۔

۲- رسالہ مصنف کا بھی کانفرنس سے کوئی تعلق نہیں تھا، الطاف علی صاحب نے ایک تنظیم مجلس مصنفین قائم کی تھی، یہ اس کا ترجمان تھا۔

۳- سید مصطفیٰ علی بریلوی سید الطاف علی صاحب کے برادر عم زاد نہیں ہیں بلکہ برادر زادہ ہیں، وہ انہیں چچا کہتے تھے۔

معارف کے اسی شمارے میں پروفیسر نذیر احمد صاحب سے متعلق وارث ریاضی صاحب کی تحریر بہت اچھی ہے، بلاشبہ فارسی زبان وادب میں پروفیسر نذیر احمد اس وقت سب سے بڑا نام ہے، بالخصوص نذیر احمد صاحب کے جو اقوال ریاضی صاحب نے نقل کئے ہیں وہ آب زر سے لکھے

جانے کے قابل ہیں، شیخ سعدی پر اس انداز میں شاید کسی اور نے نظر ڈالی ہو، ہمارے اہل قلم کو ان کی یہ نصیحت بھی گرہ باندھنی چاہیے کہ وہ ان ہی موضوعات پر لکھیں یا بولیں جن کی انہوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہو، ریاضی صاحب نے پروفیسر نذیر احمد کے حق میں جو دعا کی ہے اس پر میری زبان سے بے ساختہ آمین نکلا۔

نیاز مند
ریاض الرحمان شروانی

نثر المرجان اور تفسیر فیض الکریم

20/44 Pudupet Garden Street,
Chennai - 600 014.

بخدمت جناب اڈیٹر صاحب

السلام علیکم

معارف ماہ دسمبر ۲۰۰۶ء میں ڈاکٹر عبدالرحیم صاحب ملتان کا مضمون ''برصغیر پاک و ہند میں تفاسیر وتراجم کا آغاز وارتقا'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے، اس کے صفحہ ۴۴۱ پر اس عہد کے تراجم وتفاسیر کے بغلی عنوان میں نثر المرجان فی رسم قلم القرآن، شیخ محمد غوث بن ناصر الدین (م ۱۸۰۸ء) تحریر ہے، اس کے متعلق عرض ہے کہ یہ کتاب قرآن مجید کے رسم الخط پر لکھی گئی ہے، اس لئے اس کا ذکر اس عنوان کے تحت کرنا غلط ہے، کتاب کا صحیح نام ''نثر المرجان فی رسم نظم القرآن'' ہے، حیدرآباد دکن میں سات ضخیم جلدوں میں طبع کی گئی ہے، مولف کا نام محمد غوث بن ناصر الدین محمد ہے، ان کو والا جاہ کی طرف سے شرف الملک کا خطاب دیا گیا تھا، تاریخ وفات ۱۱؍صفر ۱۲۳۸ھ ہے، عیسوی سال ۱۸۲۲ء نہ کہ ۱۸۰۸ء، جو مضمون میں درج ہے۔

مذکورہ مضمون میں امام العلما مولوی محمد صبغۃ اللہ قاضی بدر الدولہ (المتوفی ۱۲۸۰ھ) کی ''اردو تفسیر فیض الکریم'' کا ذکر نہیں ہے، قاضی بدر الدولہ عالم اسلام کے مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے دادا ہوتے ہیں، تفسیر فیض الکریم سات ہزار صفحوں پر مشتمل ہے، بہ قول ڈاکٹر محمد حمید اللہ ''قاضی

بدر الدولہ کو ملک کی اردو زبان میں کسی اچھی تفسیر کے فقدان کا اتنا ملال تھا کہ عمر کے آخری حصہ میں تن من دھن سے اس کی تلافی میں مشغول ہو گئے''۔

آپ کا مخلص
عبید اللہ

دسمبر ۲۰۰۶ء کا معارف

گیان پور، بھدوہی
۱۰ر دسمبر ۲۰۰۶ء

مکرم و محترم جناب مولانا صاحب
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معارف دسمبر کا سر مقالہ دیکھ کر حاضر خدمت ہو رہا ہوں، سرخی پر نظر پڑتے ہی مہمیز لگی، ''حضرت مروان اموی''۔ جمع الفوائد جلد ایک سے چند حدیثیں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں، حکم بن العاص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا ''ائذنوا لہ فعلیہ لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین، وما یخرج من صلبہ یسرفون فی الدنیا، ویرذلون فی الآخرۃ ذوو مکر و خدیعۃ'' (ص ۳۲۶) اسی صفحہ پر امام حسن علیہ السلام سے مروی ہے ''فواللہ لقد لعنک اللہ علی لسان نبیہ ﷺ وانت فی صلب ابیک'' اس سے پہلے اسی صفحہ پر حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ سے ہے کہ حرم کعبہ میں لوگوں کو بتاتے تھے، ورب ھذہ الکعبۃ لعن اللہ الحکم وما ولد علی لسان نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم (۱)۔

مروان کا ایک کارنامہ (۲) یہ ہے کہ جنگ جمل میں سب سے پہلے اسی نے حضرت طلحہؓ کو شہید کیا تھا (طبقات ابن سعد، ج ۵، ص ۲۶) جب کہ وہ جنگ سے منہ موڑ کر جا رہے تھے، اس سے پہلے حضرت علیؓ نے فرما دیا تھا کہ آج جو شخص جنگ کی ابتدا کرے گا کل وہ اللہ کے نزدیک دشمن سمجھا جائے گا (طبری، ج ۶، ص ۳۱۶۸، ذکر سن ۳۶ھ، تاریخ اسلام اول، ص ۲۴۶ و سیرت

عائشہ، ص ۱۴۲) اور یہ وہ جنگ ہے کہ اس کے قائدین میں حضرات زبیرؓ و طلحہؓ جنگ سے پہلے ہی ہٹ گئے تھے اور حضرت عائشہؓ بھی حوأب سے ہٹ رہی تھیں کہ لوگوں نے جھوٹی قسم کھا کر انہیں روکا پھر زندگی بھر یہ افسوس کرتی رہیں (سیرت عائشہ، ص ۱۲۷، کمپیوٹر ایڈیشن) اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں ''لم اجدنی آسی علی شئی الا انی لم اقاتل الفئۃ الباغیۃ مع علی'' (جمع الفوائد ج ۲، ص ۲۸۷)۔

پروفیسر صاحب کے قول ''حضرت مروانؓ بلکہ ہماری تاریخی بے شعوری کا المیہ یہ ہے کہ حضرت موصوف کی ذات والا صفات اور ان کے کارناموں کو قطعی سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ ان کو بے عقلی و بے دینی سے متہم کیا گیا''۔ (معارف، ص ۴۰۸) کی زد کس پر پڑتی ہے۔

ع بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

یہ لکھنے کی جسارت پروفیسر صاحب کے دوسرے قول ''خطائے بزرگاں نہ گرفتن خطا است'' کی بنا پر ہے، یہ بات میں نے خود موصوف کی زبان سے دار المصنفین میں فرماتے ہوئے سنی تھی۔

جناب ریاض الرحمان خاں شروانی صاحب کے مقالہ کی داد تو مرحوم سید صباح الدین عبد الرحمان صاحب ہی دے سکتے تھے، ان کی روح ضرور خوش ہوئی ہوگی، کچھ اشارے بہت پہلے ''تنقیدی اشارے'' میں پروفیسر آل احمد سرور نے کیے تھے، عطیہ کی بڑی بہن کا نام ایک جگہ نازکی لکھ گیا ہے صحیح نازلی ہے، ص ۴۲۲ پر مولانا وحید الدین فراہی پر حاشیہ میں ''غالباً مولانا وحید الزمان'' مگر یہ فراہی اور سن کی مطابقت نہیں ہے، ص ۴۳۸ پر ''مخلص بن عبد الدہلوی'' میں بھی کچھ چھوٹ گیا ہے یا عبد الدہلوی نام ہی ہے، اسی صفحہ پر ''عہد اکبری (۱۵۵۶ تا ۱۶۰۶ء)'' ہے عہد اکبری تو ۱۶۰۵ء میں ہی ختم ہو جاتا ہے اور اسی سال جہاں گیر تخت نشین ہو جاتا ہے، ص ۴۴۶ پر ''..... مولانا منظور (۳) احمد نعمانی (۱۹۵۰ء)'' یہ ۱۹۵۰ء کیا ہے سن انتقال و پیدائش تو ہو نہیں سکتا اگر کتاب کا سن ہے تصنیف یا طباعت ہے تو وضاحت طلب ہے ورنہ عام طور سے مقالہ میں انتقال یا موجود کا سن پیدائش دیا ہے، ص ۴۴۸ پر ''شروح میں ایک مقدمہ ''شروع کو ''ح'' سے لکھا گیا ہے، اسی طرح پچھلے معارف میں دعا والے مقالہ میں سورۂ فاتحہ کے مفہوم میں ''رحم'' رہم چھوٹے ''ہ'' سے ہے (ص ۳۲۵)، ص ۴۶۵ پر ''اللہ تعلیٰ'' ہے، ص ۴۵۵ پر ''عبد الرحمن وردو

حافظ برخوردار "بہ دردو" کیا ہے (۴و۵)، زینب الغزالی کے والد نے تو ان کا نام نسیبہ رکھا تھا، یہ زینب کیسے ہوگئیں، اس کی کوئی وضاحت نہیں ہے، امید کہ مندرجہ بالا گذارشات بار خاطر نہ گزریں گی کہ جناب نے خود مکرر وضاحت کے لئے فرمایا ہے۔

سب سے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہیں۔

والسلام
ناچیز
شاہ ظفر الیقین

---

(۱) جو روایتیں آپ نے نقل کی ہیں ان کے متعلق یہ وضاحت ضروری تھی کہ محدثین کے نزدیک وہ مستند وموثق ہیں یا نہیں، مجھے تو سردست اس کی تحقیق وتنقید کا موقع نہیں، ممکن ہے صاحب مقالہ اس پر اور آپ کے دوسرے نکتوں پر روشنی ڈالیں، روایتی معیار سے ہٹ کر محدثین نے ان کی صحت کا ایک معیار درایت کو بھی قرار دیا ہے، میرے خیال میں درایتاً یہ حدیثیں صحیح نہیں ہوسکتیں، رسول اکرم ﷺ کی شان رحمت سے یہ قطعاً بعید ہے کہ وہ کسی پر لعنت بھیجیں یا اسے مردود قرار دیں اور اس کے لئے بددعا کریں، آپ ﷺ نے تو سخت ذہنی وجسمانی اذیتیں پہنچانے والے کے لئے ہدایت کی دعا کی ہے، حضرت ابن عمرؓ کے ارشاد "فئة باغيه" کا تعلق جنگ صفین سے معلوم ہوتا ہے، جنگ جمل کو تمام تر مروان ہی کی سازش قرار دینا اصل واقعات وحقائق سے چشم پوشی کا نتیجہ ہے۔ (۲) آپ نے اس کارنامے کا کوئی ذکر نہیں کیا جسے مقالہ نگار نے بیان کیا ہے، اصلاً تو اسی سے آپ کو تعرض کرنے کی ضرورت تھی اور اسی کی غلطیاں دکھانی چاہیے تھی مگر آپ ان مسائل میں پڑ گئے جن کا تعلق حب علی یا بغض معاویہ سے ہے۔ (۳) مدیر "الفرقان" تو مولانا محمد منظور نعمانی تھے، جن کے دروس قرآن کا مجموعہ چھپ گیا ہے، یہ مولانا منظور احمد نعمانی کوئی اور صاحب ہوں گے، میں بھی ان سے واقف نہیں ہوں۔ (۴) مخلص بن عبدالدہلوی اصل کے مطابق ہے۔ (۵) یہ عبدالرحمان درد اور حافظ برخوردار ہے جیسا کہ مقالے میں تحریر ہے اور حافظ برخوردار کا ذکر "خزینۃ الاصفیا" جلد اول ص ۱۹۳ پر ہے۔

مطبوعات جدیدہ

شرح کتاب الادب من سنن ابی داؤد للامام ابی داؤد سجستانی: از جناب مولانا انوار احمد اعظمی، بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات: ۵۴۰، قیمت: درج نہیں، پتہ: جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڈھ اور مکتبہ ندویہ، دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ۔

صحاح ستہ میں امام ابوداؤد کی سنن شامل ہی نہیں، بعض حیثیتوں مثلاً قوت رواۃ کے لحاظ سے صحیحین کے بعد اس کو تفوق حاصل ہے، زیر نظر کتاب اسی سنن ابی داؤد کے کتاب الادب کی روایتوں کے ترجمہ، تشریح اور توضیح کی ایک مبارک کوشش ہے، لائق مصنف حدیث شریف کے درس کی خدمت عرصے سے انجام دے رہے ہیں، اصلاً یہ تدریسی یادداشتیں ہیں لیکن جس سلیقے سے ان کی تیاری کی گئی ہے یعنی لغات کا حل، ترجمہ، تشریح، تحقیق رجال، فائدہ اور تنبیہ کا اہتمام، اس سے اس شرح کی اہمیت دوچند ہوگئی ہے، اسلوب اور زبان سلیس وسادہ ہے، شروع میں چند علما کی تعارفی وتحسینی تحریریں ہیں، طلبائے حدیث کے لئے اس کی افادیت ظاہر ہے لیکن دوسروں کے لئے بھی یہ شرح قابل قدر ہے۔

سلسلہ قلندریہ: از جناب مولانا عبید اللہ کوٹی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات: ۲۵۶، قیمت: ۷۰ روپے، پتہ: فرید بک ڈپو، ۲۱۵۸، ایم پی اسٹریٹ، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔

لفظ قلندر کی عوامی مقبولیت اور خواص میں اس کے احترام واہمیت کے باوجود علم وتصوف کی تاریخ، خصوصاً اس کے تذکروں اور سلاسل کے مجموعوں میں اس کے ذکر سے اگر بے اعتنائی ظاہر ہوتی ہے تو شاید یہ بھی شان قلندرانہ ہے، کتاب کے پیش لفظ میں فاضل محقق ڈاکٹر نثار احمد فاروقی مرحوم کا شکوہ برحق ہے کہ تصوف کے بڑے خانوادوں کے برخلاف اس شعبہ کا ذکر کم ہی ہے لیکن اس کے اسباب کی نشان دہی نہیں کی گئی کہ اس میں بعض مقامات بہرحال سخت ہیں، مثلاً ایک بزرگ کا یہ فرمانا کہ "ترک فرائض من حیث الظاہر کا طعن ہم نہیں کر سکتے اس لئے کہ حضرت حق نے ان حضرات کو مرتبہ روحی ایسا عطا فرمایا ہے کہ ایک حال اور ایک وقت میں بتجسد ارواح اپنے کو

کئی جگہ دکھا سکتے ہیں" یا یہ کہ "سکر حال اور مستی باطن ان پر اس قدر غالب آجاتی ہے کہ ان کے اعمال ظاہری میں قلت ہو جاتی ہے"، اس کتاب میں فاضل مصنف نے بڑی خوبی سے سکر و استغراق کے عذر کو حرف استثنا کے حوالے کر دیا اور قلندری خصوصیات کی وہی تعریف بیان کی جو اصلاً مرد مومن کی پہچان ہے، اس لئے یہ نتیجہ بھی قرین عقل ثابت ہو گیا کہ اپنی باتوں کے لئے قلندر شرم سار نہیں ہے بلکہ ایک قلندری بزرگ کے بقول "قلندر تو چالاک فقیر ہے" اس سلسلے میں تحریک شاہ ولی اللہ سے قلندری بزرگوں کے تعلق کا مطالعہ بھی کیا گیا ہے، جو فاضل مولف کی نظر میں قلندری طریق کے اعتدال و توازن کا نتیجہ ہے، ایک تحریر تحریک ندوۃ العلما سے قلندری بزرگوں کے تعلقات پر ہے، اس میں یہ جملہ خاص طور پر پُرلطف ہے کہ تحریک ندوۃ العلما کے قلندرانہ جذب کو سب سے پہلے قلندری کی بارگاہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اردو شاعری میں قلندر کا اثر بھی دلچسپ تحریر ہے، جس میں اقبال کا ذکر ناگزیر ہے جنہوں نے رموز قلندری اس لئے فاش کیے تھے کہ جہاں کو ان کی قلندری خوش آگئی تھی، یہ درست مگر یہ کہنا کہ "ازل سے قلندروں کا جو طریق رہا ہے اس سے واقفیت کے لئے کلام اقبال کا مطالعہ ضروری ہے"، کچھ شائبہ غلو کا رکھتا ہے، قلندری بزرگوں کی تصنیفات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے، باقی ملفوظات اور سوانح کے ابواب ہیں جس میں شیخ عبدالعزیز مکی بانی سلسلہ سے فاضل مصنف کے ہم وطن بزرگ شاہ مظہر کل قلندری کوئی تک بارہ حضرات کا ذکر ہے، اس طرح اثنا عشرۃ عینا کی تطبیق بھی ہوگئی، آخر الذکر بزرگ کے حالات زیادہ مفصل ہیں، فاضل مصنف کا مزاج بھی قلندرانہ ہے، اس لئے ان کی تحریر میں مستی و سرشاری ہے، البتہ اس کتاب میں ان کے لہجے کا مدافعتی انداز جا بجا نمایاں ہے، بعض بیانات بھی محل نظر ہیں مثلاً شاہ محمد کاظم قلندر کاکوروی کے متعلق لکھا گیا کہ "ان ہی کے ذریعہ پہلی بار قلندری سلسلہ، کاکوری اور اس کے اطراف میں اشاعت پذیر ہوا"، حالاں کہ ان سے پہلے شاہ صبغۃ اللہ قلندر کا ذکر ملتا ہے جن سے شاہ کاظم کے چھوٹے بھائی اور محسن کاکوروی کے جد اعلا شاہ میر محمد قلندر اور ان کی والدہ مرید ہوئی تھیں، شاہ غلام حسنین پھلواری کو خانقاہ مجیبیہ کا سجادہ نشین کہا گیا ہے، یہ درست نہیں ہے، ایک جگہ تفریح الاذکیا اور تذکیر الاخوان کو شاہ میر محمد قلندر کی علمی یادگار بتایا گیا ہے جب کہ یہ دونوں کتابیں حسن بخش قلندر کی ہیں، تحفہ نیشاپوریہ کو سید احمد ہرگامی کی تصنیفات میں شامل کیا گیا ہے، یہ

اصلاً شاہ باسط علی قلندر کی کتاب ہے، مولف رشیدیہ دیوان عبدالرشید قلندر کا مزار سرائے میر نہیں جون پور میں ہے، اسی طرح شاہ فتح علی قلندر کا قلندر پور جون پور سے کوئی تعلق نہیں، شاہ محمد قطب جون پوری کا ماہ وفات بجائے ذی الحجہ، ذی قعدہ صحیح ہے، شیخ قطب الدین بینا دل کے ایک خلیفہ سید گوشائیں کے متعلق لکھا گیا کہ ان سے قلندری نسبت کا فیض خانقاہ مجیبیہ پہنچا لیکن صحیح یہ ہے کہ حضرت شیخ کے پرپوتے شاہ عبدالقدوس قلندر کے خلیفہ شاہ مجا قلندر سے یہ فیض پھلواری پہنچا، شاہ حبیب حیدر قلندر کو شاہ علی اکبر قلندر کا صاحب زادہ بتایا گیا ہے حالاں کہ یہ پوتے تھے۔

سیرت بانی دار العلوم دیوبند: از علامہ سید مناظر احسن گیلانیؒ، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت مناسب، مجلد، صفحات: ۱۳۳، قیمت: ۹۰ روپے، پتہ: مکتبہ رشیدیہ، عائشہ منزل، نزد مقدس مسجد اردو بازار، کراچی۔

قریب ستر سال پہلے دیوبند کے مجلہ دارالعلوم میں مولانا گیلانیؒ کا ایک طویل مضمون دارالعلوم کے بانی کی کہانی کچھ ان ہی کی زبانی کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا اور یہ مولانا قاسم نانوتویؒ کے سوانح پر یقیناً ابتدائی تحریروں میں ہے، ضرورت تھی کہ اس مضمون کو کتابی شکل میں شائع کیا جاتا کہ مولانا گیلانی کی ہر تحریر، معلومات کے علاوہ مولانا کے خاص انداز اور پاک جذبے کی وجہ سے ایک جدا لطف و رعنائی رکھتی ہے، شمیم گل کی تصویر کھینچنا واقعی ماہر سے ماہر نقاش کے بس کی بات نہیں لیکن اس مختصر سوانح میں اعجاز گیلانی ہے کہ مولانا نانوتوی کے متعلق غیر محسوس جذبات کی پیکر تراشی کا بہترین مظاہرہ ہوا ہے، سوانح قاسمی میں یہ شاید موثر ترین تحریر ہے جس کی اشاعت کے لئے لائق مرتب جناب محمد عامر قمر شکریے کے مستحق ہیں، شروع میں مولانا قاری محمد طیب کا ایک عمدہ مضمون بھی ہے اور مرتب کے علاوہ ڈاکٹر شاہ جہاں پوری کے پیش لفظ نے کتاب کی افادیت میں اضافہ کیا ہے۔

قاضی عبدالودود شخصیت و خدمات: از ڈاکٹر تحریر انجم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۶۰۰، قیمت: ۲۵۰ روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ نمبر ۲ اور دوسرے مکتبے۔

قاضی عبدالودود کا شمار صف اول کے محققین میں ہوتا ہے بلکہ درصیغۂ تحقیقات ان کو قاضی کا درجہ حاصل ہے اور یہ اس لئے کہ بجا طور پر "تحقیق ان کا مشغلہ نہیں مقصد حیات ہے" ان کی

تحقیقی خدمات اور محققانہ مرتبہ ومقام کا اعتراف عام ہے لیکن ان کی زندگی، شخصیت اور علمی کارناموں پر ایک مفصل اور جامع کتاب کی ضرورت تھی اور یہ زیر نظر تالیف سے پوری ہوتی نظر آتی ہے، اصلاً یہ ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے لیکن جس محنت، تلاش وتفحص اور تدقیق سے اس کو مکمل کیا گیا ہے، انصاف یہ ہے کہ اب ایسے مقالے کم ہی نظر آتے ہیں، پانچ ابواب اصل ہیں کہ ان میں قاضی صاحب کی حیات، تحقیقی شعور کا ارتقا، تحقیقی کارنامے اور غالبیات میں ان کی کاوشیں اور اردو تحقیق پر ان کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے، ضمیمے کے طور پر ان کی کتابوں اور مقالوں بلکہ ہر تحریر کی ایک فہرست بھی دی گئی ہے، قاضی صاحب کی تحقیقی کاوشوں میں غالبیات سب سے نمایاں عنوان ہے، غالب بہ حیثیت محقق ان کا واقعی شاہ کار مقالہ ہے جس میں قاضی صاحب کے کاری فیصلوں نے غالب کو خستہ جاں کر دیا لیکن یہ کہنا کہ محققین غالب میں ان کا ہم مرتبہ اور کوئی نہیں، شاید قاضی صاحب کے ساتھ ناانصافی ہے، قاضی صاحب کی علمی وتحقیقی زندگی کی تفصیل بہت دل چسپ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذوق کی تربیت میں علامہ شبلیؒ کا بڑا حصہ ہے، کم لوگوں کو علم ہوگا کہ قاضی صاحب کا پہلا مضمون "جامع الاخلاق" کے عنوان سے فروری ۱۹۲۳ء کے "معارف" میں شائع ہوا، گو اس سے پہلے ۱۹۲۲ء میں باب التقریظ والانتقاد کے تحت ان کا ایک مراسلہ بھی معارف میں شائع ہوا تھا، قاضی صاحب کا خیال تھا کہ مرنے کے بعد انسان کے زندہ ہونے کا امکان بہت کم ہے لیکن وہ یہ بھی مانتے تھے کہ مذہب سے اطمینان قلب نصیب ہوتا ہے، لائق مصنف کی سلامت روی نے کوشش کی کہ وہ قاضی صاحب کے مذہبی پہلو کو مثبت انداز میں پیش کریں لیکن ان کے جذبہ انصاف نے بہرحال اس فیصلہ پر آمادہ کرلیا کہ یہ المیہ ہے کہ قاضی صاحب جیسا مایہ ناز محقق مذہب کے معاملے میں فکری ژولیدگی کا شکار ہوکر اسلام جیسے دین فطرت سے بھی منحرف ہوگیا، تاہم ان کی شخصیت میں اسلام کی اعلا قدروں کے اوصاف بہرحال تھے، کتاب خاصی ضخیم ہے، کہیں کہیں مضامین کی تکرار اور کہیں کہیں غیر ضروری تمہید کا احساس ہوتا ہے لیکن ڈاکٹریٹ کے مقالے میں ان کو وجہ جواز حاصل ہے، کتابت کی غلطیاں بھی ہیں ان سے بچنا مشکل ہے لیکن سفر وحجر میں ٹھوکر کا احساس ہوتا ہے، مجموعی لحاظ سے یہ قاضی صاحب کے شایان شان بہترین کتاب ہے اور لائق مرتب اس کے لئے تحسین و تبریک کے مستحق ہیں۔

ع-ص

علامہ شبلی نعمانیؒ کی تصنیفات

کتاب	مصنف	Pages	Rs
۱۔سیرۃ النبیؐ اول (مجلد اضافہ شدہ کمپیوٹر ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	512	190/-
۲۔سیرۃ النبیؐ دوم (مجلد اضافہ شدہ کمپیوٹر ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	520	190/-
۳۔مقدمہ سیرۃ النبی	علامہ شبلی نعمانی	74	30/-
۴۔اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	علامہ شبلی نعمانی	146	85/-
۵۔الفاروق (مکمل)	علامہ شبلی نعمانی	514	95/-
۶۔الغزالی (اضافہ شدہ ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	278	120/-
۷۔المامون (مجلد)	علامہ شبلی نعمانی	248	65/-
۸۔سیرۃ النعمان	علامہ شبلی نعمانی	316	130/-
۹۔الکلام	علامہ شبلی نعمانی	324	65/-
۱۰۔علم الکلام	علامہ شبلی نعمانی	202	35/-
۱۱۔مقالات شبلی اول (مذہبی)	مولانا سید سلیمان ندوی	236	65/-
۱۲۔مقالات شبلی دوم (ادبی)	مولانا سید سلیمان ندوی	108	25/-
۱۳۔مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	مولانا سید سلیمان ندوی	180	32/-
۱۴۔مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	مولانا سید سلیمان ندوی	194	35/-
۱۵۔مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	مولانا سید سلیمان ندوی	136	25/-
۱۶۔مقالات شبلی ششم (تاریخی)	مولانا سید سلیمان ندوی	242	50/-
۱۷۔مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	مولانا سید سلیمان ندوی	124	25/-
۱۸۔مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری)	مولانا سید سلیمان ندوی	198	55/-
۱۹۔خطبات شبلی	مولانا سید سلیمان ندوی	190	35/-
۱۹۔مکاتیب شبلی (اول)	مولانا سید سلیمان ندوی	360	40/-
۲۰۔مکاتیب شبلی (دوم)	مولانا سید سلیمان ندوی	264	35/-
۲۱۔سفرنامہ روم ومصر وشام	علامہ شبلی نعمانی	238	80/-

۲۲۔شعرالعجم (اردو) (اول ص 274 قیمت -/85) (دوم ص 214 قیمت -/65) (سوم ص 192، قیمت -/35)
(چہارم ص ، قیمت) (پنجم ص 206، قیمت -/38) (کلیات شبلی ص 124، قیمت -/25)